جلد:۷، شمارہ : ۳،۴
جولائی-دسمبر : ۲۰۲۰ء

ISSN : 2394-5567
S.No. 20

دبیر

مدیر

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

DABEER July - December 2020 S.No. 20

ISSN : 2394-5567
S.No. 20

Vol. : 7, Issue : 3 & 4
July - December : 2020

DABEER

Editor:-

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

ISSN:- 2394-5567 S.No. 20

بخواندم یکی مرد هندی دبیر   سخن گوی و گوینده و یادگیر   (فردوسیؔ)

دبیر

(بین الاقوامی پیئر ریویوڈ ریفیر یڈ سہ ماہی ادبی وتحقیقی جریدہ)

جلد۔۷   شمارہ۔۳،۴

جولائی۔دسمبر ۲۰۲۰ء

☆ایڈیٹر☆

احمد نوید یاسر ازلان حیدر

Mob. no. 09410478973

☆مراسلت کا پتہ☆

دبیر حسن میموریل لائبریری

۱۲۔چودھری محلّہ (جنوبی)، کاکوری، لکھنؤ۔۲۲۶۱۰۱

dabeerpersian@rediffmail.com

☆ریویو کمیٹی☆
پروفیسر آذرمی دخت صفوی، علی گڑھ
پروفیسر شریف حسین قاسمی، دہلی
پروفیسر مسعود انور علوی کاکوروی، علی گڑھ
پروفیسر عمر کمال الدین کاکوروی، لکھنؤ
پروفیسر طاہرہ وحید عباسی، بھوپال
پروفیسر مظہر آصف، نئی دہلی

☆مجلس ادارت☆
پروفیسر سید حسن عباس، صدر شعبہ فارسی، دانشگاہ ھندوی، بنارس
پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، ڈائرکٹر آئی پی آر، اے ایم یو علی گڑھ
پروفیسر علیم اشرف خان، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی، دہلی
پروفیسر سید محمد اصغر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی، شعبۂ فارسی، مانو، حیدرآباد
ڈاکٹر محمد عقیل، شعبہ فارسی، دانشگاہ ھندوی، بنارس
ڈاکٹر افتخار احمد، شعبۂ فارسی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ
ڈاکٹر محمد قمر عالم، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ڈاکٹر انجمن بانو صدیقی، شعبہ فارسی، کرامت کالج، لکھنؤ

☆معاون مدیر☆
ڈاکٹر محمد توصیف خان کاکر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
عاطفہ جمال
ریسرچ اسکالر، شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

فہرست مندرجات

	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
	اداریہ	ازلان حیدر	۵
۱	کلام اقبال میں سوز وعشق	ڈاکٹر جہانگیر اقبال ڈاکٹر ثمینہ امین	۶
۲	عہد نوابین میں فن طب اور چند معروف اطبائے اودھ	ڈاکٹر زہرہ خاتون	۱۰
۳	انقلاب اسلامی کے بعد ایرانی شاعری میں تحولات	ڈاکٹر محمد قیصر	۱۷
۴	عصر حاضر میں داراشکوہ کے صوفیانہ کلام کی اہمیت	ڈاکٹر نیلوفر حفیظ	۲۶
۵	غالب کی ایک فارسی غزل: ایک تجزیہ	سید مزمل مرتضیٰ	۳۸
۶	شاہ تراب علی قلندر کاکوری اور انکی فارسی شاعری	جاوید احسن	۴۳
۷	سندیلہ کے چند نامور فارسی شعراء	عاطفہ جمال	۴۸
۸	تذکرہ نویسی کا فن	غزالہ حفیظ	۵۷
۹	حضرت شیخ سرمد ایک ہمہ جہت شاعر	محمد اقبال بابا	۷۲
۱۰	حکیم حاذق گیلانی کے کلام میں جمالیاتی عناصر	محمد شہباز	۸۱
۱۱	جلال الدین خلجی کے نظریات و مذہبی رجحانات	صائمہ احمد	۸۸
	شخصیات		
	فارسی کے اساتذہ سیریز۔۴		
۱۲	پروفیسر اقبال حسین	پروفیسر رضوان اللہ آروی	۹۶
	دکنیات		
۱۳	کوائف سلاطین گلبرگہ لب التواریخ کی روشنی میں	اسماء	۱۱۶
	میراث خطی		
۱۴	تذکرہ بے نظیر: مولف اور قلمی نسخوں کا تعارف	محمد رضا اظہری	۱۲۵
	چشم بینش		
۱۵	زبور عجم پر ایک طائرانہ نظر	ڈاکٹر عالم اعظمی	۱۳۲
۱۶	اصول التفسیر	سید نور عالم	۱۴۰

English Artilces

1	The Geo-Physical features of the Suba of Allahabad	Dr. Mohammad Anash	3
2	Sarojni Naidu and the Persian Sensibility: Mapping her literary landscape	Md. Shakeel	15
3	Reading Iranian Renaissance through fiction	Mohammad Fahad Ansari	22
4	Eminent slaves of Sultan Eltutmish: A political perspective	Shama Rehmani	27
5	India, Turkey And Israel: War Against Terrorism	Aijaz Ahmad	34

اداریہ

ہندوستان کی تاریخ میں اسلامی عہد حکومت ایک زرین عہد تھا جس میں تمام باشندگان کو یکساں حقوق اور سہولیات میسر تھیں۔مسلمانوں نے اسلامی تہذیب کے دور عروج سے استفادہ کر کے اس خطہ ہندوستان کو بھی مختلف علوم وفنون کا مرکز بنا دیا تھا۔اسلامی عہد کا ہندوستان خوشحال اور ترقی یافتہ تھا،قرب وجوار کے خطوں سے لوگ حصول علم کے لیے ہندوستان کا رخ کرتے تھے اور ہندوستان کی تہذیبی ترقی کی بدولت تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف حکمرانوں نے اسے فتح کرنے کی کوشش کی۔مسلمانوں کی یہ تمام تر ترقی اسلام کے نظریہ تعلیم کی بنیاد پر تھی۔افسوس کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخیں تو بہت لکھی گئیں مگر علمی تاریخ کی طرف ذیادہ توجہ نہیں دی گئی،یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی کارناموں سے تو ایک جہاں واقف ہے مگر ان کے علمی کارناموں سے خال خال لوگ ہی واقف ہیں۔

تاریخ کی اکثر کتب میں مسلم ہندوستان کی تعلیمی درسگاہوں اور ان کے نظام تعلیم کے بارے میں بہت کم مواد ملتا ہے۔محمد تغلق کے عہد میں ہندوستان اور مصر کے درمیان تعلقات عروج پر تھے،اسی دور کا ایک مصری سیاح اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ صرف دلی میں ایک ہزار مدرسے تھے جن میں ایک شافعی اور باقی سب حنفی تھے۔ایک یورپی سیاح کپتان الگزنڈر ہملٹن اورنگزیب عالمگیر کے عہد میں سندھ کے شہر ٹھٹھہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ ٹھٹھہ میں مختلف علوم وفنون کے چارسو سے زائد مدارس تھے۔مسلمان اپنے مذہبی ذوق کی بنا پر تعلیم وتعلم کو لازم اور درسگاہوں کے قیام اور علماؤ طلبہ کی خدمت کو سعادت سمجھتے تھے۔ قدیم ہندوستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کا انداز یہ تھا کہ تعلیم کے لیے الگ عمارتیں قائم نہیں کی جاتی تھیں بلکہ یہ کام مساجد سے لیا جاتا تھا اور اس دور کی ہر مسجد بذات خود ایک درسگاہ ہوا کرتی تھی۔مسجدوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے حجرے طلبہ اور علماء کی رہائش کے کام آتے تھے۔ایک اہم ذریعہ تعلیم خانقاہیں ہوا کرتی تھیں،صوفیاء کرام تزکیہ نفس کے ساتھ مختلف علوم کی محفلیں سجاتے تھے۔حکومتوں کی طرف سے خانقاہوں کو جو وظائف جاری کیے جاتے تھے وہ طلباء کی رہائش اور طعام پر خرچ ہوتے تھے۔اور اس نظام سے فیض یاب ہونے والے تمام عالم میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا کام کیا کرتے تھے مگر دور حاضر میں طلباءِ مدارس کو عام مسلمان بھی حقیر تصور کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ صرف مسجدوں کے امام ہی بن سکتے ہیں۔بڑے مدارس تو اپنے پرانے نظام کے تحت آج بھی خدمات انجام دے رہے ہیں مگر بہت سے چھوٹے چھوٹے مدارس اب اپنی زبوں حالی پر گریہ کناں ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کی آمد کے منتظر ہیں۔ہمارا ایک دینی فریضہ یہ بھی ہے کہ کم ازکم ان کی مدد تو کی جائے کہ یہ نظام شہروں کے علاوہ دیہات وقصبات میں بھی چلتا رہے۔

ازلان حیدر

ڈاکٹر جہانگیر اقبال
ڈاکٹر ثمینہ امین
شعبہ فارسی، دانشگاہ کشمیر، سری نگر

کلامِ اقبال میں سوز و عشق

شاعر مشرق، ترجمانِ حقیقت، شاعر فلسفی، دانائے راز، حکیم الامت، علامہ اقبال کا تعلق ایک کشمیری برہمن خاندان سے تھا۔ بعد میں جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ ان کا خاندان کشمیر سے سیالکوٹ آ کر بس گیا تھا۔ علامہ اقبال کی ولادت سیالکوٹ میں ہوئی۔ ان کی تاریخ ولادت کی مختلف آرا ہیں کئی سال تک مصنفین کا ۲۲ فروری پر اصرار رہا۔ اب بزم اقبال لاہور والے ۲۹/ دسمبر ۱۸۸۳ء بتاتے ہیں۔ اقبال اکیڈمی کراچی کے ارباب کو ۹ نومبر ۱۸۷۷ء پر یقین ہے۔

اقبال نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہی حاصل کی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم مولوی سید میر حسن سے حاصل کی۔ اقبال کو فلسفہ سے خاص لگاؤ تھا۔ لہٰذا انگلینڈ کی کیمبرج یونیورسٹی جا کے فلسفے کی پڑھائی کی۔ لندن یونیورسٹی میں چھے مہینے تک عربی کا درس بھی دیا۔ اس کے بعد جرمنی سے ڈاکٹریٹ اور لندن سے بیرسٹری کی سند حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں آپ وطن باپس لوٹے واپسی پر آپ نے کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کی تدریس کی۔ اس کے بعد ملازمت ترک کر لی اور مدت العمر وکالت ہی کی۔

کلیدی الفاظ: علامہ اقبال کے مختصر احوال، اقبال کی اردو اور فارسی شاعری کی شہرت:

زمانہء طالب علمی سے ہی اقبال کا اصلی جوہر چمکنے لگے اور طبیعت خود بخود شاعری کی طرف متوجہ ہونے لگی۔ اقبال نے ابتدائی اشعار داغ دہلوی کو اصلاح کی غرض سے بھیجا کرتے تھے۔ اقبال کے اردو اور فارسی اشعار میں ابتداء سے ہی صوفیانہ اثرات دیکھائی دیتے تھے۔ اقبالؒ مولانا جلال الدین رومی کے کلام کو بے حد پسند کرتے تھے۔ رومی کے علاوہ فارسی کے بہت سارے صوفی شاعروں کو بھی بحسن خوبی مطالعہ کیا تھا۔ جس کی وجہ سے اقبال کے کلام پر تصّوف کے اثرات بہت نمایاں ہوئے۔

اقبال ابھی زیر تعلیم تھے کہ ان کی شاعری کی بہت پزیرائی ہونے لگی۔ جب لاہور کے گورنمنٹ کالج میں بے۔ اے کر رہتے تھے ایک مشاعرے میں شرکت کی۔ اِس وقت ان کی عمر صرف ۲۳ سال کی تھی مگر افکار و خیالات اتنے بلند تھے

کہ اساتذہ شعراء کی نظریں آپ پر تھی۔اور جب مشاعرے میں یہ شعر پڑھا

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چن لئے　　　قطرے جو تھے میرے عرقِ انفصال کے

تو اس مشاعرے کے ایک بزرگ شاعر مرزا ارشد گارگونی تڑپ کر بولے۔میاں صاحبزادے! سبحان اللہ، اس عمر میں یہ شعر۔

اقبال نے ۱۸۹۹ء میں انجمن اسلام کے ایک جلسے میں "نالہ یتیم" پڑھی تو سامعین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔اقبال کا کلام کالج کے دور میں ہی ماہنامہ "مخزن لاہور" میں شائع ہونے لگا تھا۔

اقبال بیسوی صدی عیسوی کے عظیم ترین شاعر ہے ان کی عظمت کا سکہ کئی صدیوں بلکہ ابدلاباد تک چلے گا۔ ایرانی شعراء نے موجودہ صدی کو "قرن اقبال" قرار دیا ہے:

قرن حاضر خاصه اقبال بود　　　کز قیامش لذت ایمان فرمود

قرن حاضر خاصه اقبال گشت　　　واحدی کز صد ہزاران بر گذشت

اقبال کے اردو اور فارسی شعری مجموعے:

اقبال کا کلام اردو اور فارسی زبان کی شعری مجموعوں پر مبنی ہے جن میں اصلاح معاشرت کے لیے تعلیمات قرآنی پر عمل پیدا ہونے کی تاکید ہے، ہمدردانہ محنت ومشقت کی پُر خلوص دردمندانہ صدائیں بھی اور انسانیت کے خفتہ و پسماندہ طبقوں کو زندگی کی اُمنگ اور تحصیل و تسخیر کے لیے بیدار و مستعد ہونے کی تلقین بھی کی ہے۔اقبال نے اپنے کلام میں اکثر کشمیری ثقافت اور فطری حُسن کا ذکر بھی کیا۔اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیر علامہ اقبال کا وطنِ مالوف ہے اور وہ ایک عالم ہجر میں موتی عدن سے لعل ہوا ہے۔اقبال اپنے لئے یہ سعادت اور فخر محسوس کرتے تھے۔کہ آپ کشمیر الاصل اور کشمیر النسل ہیں۔جبھی تو وہ کہتے ہیں:

تنم گلی ز خیابان جنت کشمیر　　　دل از حریم حجاز و نواز شیراز است

علامہ اقبال کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) ابتداء سے ۱۹۰۵ء تک

(۲) ۱۹۰۶ء سے ۱۹۰۸ء تک

(۳) ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۴ء تک

(۴) ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۸ء تک

علامہ اقبال کے شعری مجموعے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں۔اردو میں ان کے تین شعری مجموعے

ہیں۔

ا۔"بانگ درا" علامہ اقبال کا پہلا اردو شعری مجموعہ ہے جو انہوں نے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا۔"بانگ درا" کو ایک خوبصورت سرمایا مانا جاتا ہے جس میں ہزاروں قسم کے رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو کے علاوہ حب الوطنی سے لبریز ترانے بھی شامل ہیں۔

علامہ اقبال نے 'بانگ درا' کو تین حصّوں میں تقسیم کیا۔

پہلا حصّہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک کا کلام

دوسرا حصّہ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا کلام

تیسرا حصّہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۴ء تک کا کلام

"بانگ درا" یعنی "گھنٹی کی آواز" گھنٹی کی آواز قافلے والوں کو روانگی کی اطلاع دیتی ہے تا کہ سوئے ہوئے مسافر سفر کے لئے تیار ہو جائیں

اقبال کا ترانہ بانگ درا ہے گویا ہوتا ہے جادہ پے پھر کارواں ہمارا

اس کے علاوہ علامہ اقبال نے "بال جبریل "۱۹۳۵ء میں اور ضرب کلیم ۱۹۳۶ء میں یہ شائع کئے۔

فارسی میں علامہ اقبال نے "اسرار خودی اور رموز بی خودی" نام کی مثنویوں کے مجموعے بھی شائع کئے۔

پہلی کا موضوع انفرادی خودی ہے اور دوسری کا اجتماعی (معاشرے کے کام آنا) اسرار ورموز کے علاوہ ان کی فارسی شعری مجموعوں میں "پیام شرق" "زبور عجم" "مثنوی مسافر اور مثنوی" پس چہ باید کرد" شامل ہیں۔

"ارمغانِ حجاز" نام کا اردو اور فارسی شعری مجموعہ جو شاعر مشرق کے وفات کے چند ماہ بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں چھپا۔ابتدائی دوحصّوں میں فارسی دوبیتیاں ہیں۔جن میں مناجات، آرزوے حج، عشق رسول اور اٰداب علاوہ ازین دیگر موصنوعات پر علامہ اقبال کے انتہائی موثر اور رقت انگیز خیالات ملتے ہیں۔اس کا آخری ایک تہائی حصہ اردو میں شامل ہے۔

کلام اقبال میں عشق تصّوف:۔

اقبال نہ صرف صوفیانہ خیالات اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں بلکہ وہ خود بھی صوفیاء کے ارادت مند نظر آتے ہیں۔انہوں نے تصّوف میں رھبانیت کی آمیزش اور تصوف کے نام پر بے عملی کی مخالفت کی۔دراصل اقبال تصوف کو اس کی ابتدائی حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔جہاں فقر و فاقہ ہے۔مگر اسی کے ساتھ شہنشاہی بھی اس فقر کے قدموں کی دھول بنتی ہے علامہ اقبال ہر مومن کو اپنی اوصاف کا حاصل دیکھنا چاہتے ہیں:

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی
عطار ہو، رومی ہو، غزالی ہو کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے آہ سحر گاہی
دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

عشق تصوف کی بنیاد ہے اور اقبال اسے مختلف انداز میں دیکھتے ہیں:

کبھی آوارہ وبے خانماں عشق کبھی شاہ شہاں نو شیروان عشق
کبھی میدان میں آنا ہے زرہ پوش کبھی عریان وبے تیغ وسنان عشق
کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق کبھی سوز و سرود انجمن عشق
کبھی سرمایہ محراب و منبر کبھی مولا علی خیبر شکن عشق

اقبال تصوف کے پُر جوش حامی ہیں۔لیکن وہ تصوف کا بے روح جسم نہیں چاہتے وہ صوفیہ کے اس دور کی طرف لوٹنا چاہتے ہیں جہاں صوفی کے ساتھ روشن ضمیری بھی ہوا کرتی تھی:

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ نہیں ممکن امیری بے فقیری

الغرض اقبال کے کلام میں تصوف کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔البتہ وہ تصوّف کے نام پر رہبانیت سستی، بے کاری، آرام طلبی کے خلاف ہیں۔صوفی اور تصوف کے تعلق سے ان کے خیالات کا اندازہ ان کی شاعری میں بہت بلند طریقے سے نظر آتا ہے:

چھپا یا حسن کلیم اللہ سے جس نے وہی ناز آفرین ہے جلوہ فرما نازنینوں میں
جلاسکتی ہے شمع کشتہ کو موجِ نفس ان کی الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں
تمنا گرِ دل کی ہے تو کر خدمت فقیروں کی نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

کتابیات:

۱۔ فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، مرتب ڈاکٹر محمد ریاض و ڈاکٹر محمد صدیق شبلی ص ۳۳۲۔
۲۔ کلیات اقبال (اردو) (پیام مشرق) شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۷۳ء ، میں ۸۲۳۔
۳۔ کلیات اقبال (اردو) (بانگ درا) حصہ سوم، نظم نمبر ۹ ترانہ ملی۔
۴۔ کلیات اقبال (اردو) بال جبریل، غزل ۲۳۔
۵۔ کلیات اقبال بال جبریل حصہ دوم

ڈاکٹر زہرہ خاتون
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

عہد نوابین میں فن طب اور چند معروف اطبائے اودھ

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان میں جن ریاستوں کو عروج حاصل ہوا ان میں سرفہرست ایک عظیم الشان ریاست صوبۂ اودھ کی تھی۔ جس کی شروعات ۱۷۲۲ء میں نواب سعادت خاں برہان الملک کے ہاتھوں ہوئی اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے ایک آزاد اور خود مختار حکومت بن گئی۔ تقریباً سوا سو سال یہ سلطنت قائم رہی جس میں شروع کے حکمراں ''نواب وزیر'' کے خطاب سے اور آخری چھ ''بادشاہ'' کے لقب سے معروف ہوئے۔ اس صوبے کو مشرقی تہذیب وتمدن کا آخری نمونہ بھی کہا جاتا ہے جس کا اختتام ۱۸۵۶ء میں آخری نواب واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ ہوا۔ اور تمام حکومت انگریزوں کی دسترس میں آگئی اور وہ اس پورے خطے پر قابض ہوگئے۔ یہ تو سیاسی صورتحال تھی لیکن جہاں ہم اس دور کے علم وادب کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان نوابین نے علم وادب کے ہر میدان میں نمایاں سرپرستی کی، خاص طور پر لکھنؤ علم وادب کا ایک اہم مرکز بن کر سامنے آیا۔ اور گذشتہ حکومتوں کے علمی ورثے میں قابل قدر اضافہ کیا۔

اودھ اور اس کے مضافات میں صدہا دانشور اور اہل علم پیدا ہوئے جنھوں نے نوابین اودھ کی سرپرستی کی بدولت عزت وشہرت اور اعلیٰ مقام حاصل کئے۔ ان میں علماء وشعراء اور دوسرے اہل فن بھی تھے جو جوق در جوق اودھ کی جانب کھنچے چلے آرہے تھے۔ ان ہی میں اطباء کی بھی ایک بڑی تعداد تھی جن کا ذکر عام تذکروں میں شاذ ونادر ہی نظر آتا ہے۔ جہاں اودھ میں دوسرے فنون نے ترقیاں اور کامیابیاں حاصل کیں وہیں طب یونانی کو بھی فروغ حاصل ہوا اور نہ اس سے پہلے ہندوستان میں آیورویدا اور جڑی بوٹیوں وغیرہ کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس فن کے ماہر حکیم اور وید ہوا کرتے تھے۔ لیکن ترکوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد یونانی علوم کو فروغ حاصل ہوا۔ مسلم دانشوروں نے اس علم کو بڑھاوا دیا اور مزید تحقیقات کی جن کے نتیجے میں بڑے بڑے حکماء واطبا سامنے آئے جو دہلی کے علاوہ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے قصبات وقریات تک جا پہونچے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی صوبائی حکومتوں کا عروج شروع ہوگیا اور یہ اطباء حیدرآباد، بنگال، گجرات واودھ کی جانب متوجہ ہوئے۔

نوابین اودھ نے دوسرے اہل علم وفن کی طرح حکماء واطباء اور فن طب کی بھی خصوصی طور پر سرپرستی کی۔ اس فن

کو بڑھاوا دینے کے لئے اطباء کی ہرممکن امداد واعانت کرتے ۔ چنانچہ اس فن کے ماہرین دہلی سے مراجعت کرتے ہوئے پہلے فیض آباد اور پھر لکھنؤ کی جانب متوجہ ہوئے ۔ نواب برہان الملک کے عہد میں کشمیر و دہلی کے حاذق اطباء کی ایک بڑی تعداد فیض آباد پہونچی جنہوں نے اپنی حکمت اور حذاقت کے جوہر دکھا کر اپنے فن کی داد پائی ۔ نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں کہا جاتا ہے کہ دہلی میں دو چار طبیبوں کے علاوہ جتنے تھے سب فیض آباد چلے آئے ۔ نواب آصف کے عہد میں لکھنؤ جب باکمالوں کا مرکز بنا تو دہلی اور فیض آباد کے اکثر خاندانی اطباء بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لکھنؤ کی جانب متوجہ ہوئے اور وہیں کی سکونت اختیار کی ۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نہ صرف نوابین اودھ بلکہ دیگر زمینداروں وتعلقہ داروں و صاحب ثروت لوگوں نے بھی اطباء کے فن کو سراہا کیونکہ صحت کہ اہمیت سبھی پر مسلم تھی اور اسے صحیح رکھنے کے لیے ہر شخص کو اطباء کی ضرورت تھی ۔ پھر وہ سلاطین ہوں ، امراء ہوں ، رؤسا ہوں یا دیگر صاحب حیثیت لوگ سبھی کو یہ خواہش ہوتی کہ وہ تندرست وتوانا ہوں تاکہ زندگی کے تمام عیش وعشرت کا بھرپور لطف حاصل کرسکیں ۔

بادشاہ نصیر الدین حیدر کے عہد میں لکھنؤ میں وزیر اودھ مہر علی خاں کی کوششوں سے ۱۸۳۲ء میں دار الشفاء کا قیام عمل میں آیا جس میں دو شعبے یونانی اور ایلوپیتھی کے الگ الگ قائم ہوئے اور علاج و معالجہ کے ساتھ ہی دواؤں کی بھی مفت سہولت تھی طلبہ کو عربی و فارسی دونوں زبانوں میں مفت تعلیم دی جاتی جس کے نتیجے میں بہت سے طلبہ فن طب میں یہاں سے فیض یاب ہو کر نکلے ۔ اطباء نے تجویدِ فن اور تصحیح کی جانب بھی توجہ مرکوز کی مطب اور نسخہ نویسی کا انداز تبدیل کیا جو کہ دہلی سے مختلف نظر آیا ۔ چنانچہ اب شعر وادب کی طرح فن طب کے بھی ہندوستان میں دو اسکول دہلی اور لکھنؤ کے نام سے مشہور ہوئے طب لکھنؤ میں اسباب وعلامت کے لحاظ سے ہر مرض کا نسخہ تیار کیا جاتا ۔ مریض کے مزاج کے مطابق ان کے ادویہ اور مرکبات تیار ہوتے ، خوراک کا بھی تعین ہوتا ساتھ ہی سبھی ادویہ اور کشتہ جات کا استعمال کم سے کم ہوتا جبکہ دہلی میں یہ طریقہ رائج نہ تھا ۔

اس مختصر تمہیدی گفتگو کے بعد آیئے دیکھیں کہ نوابین اودھ کے اس پورے دور میں وہ کون کون سی اہم شخصیات ہیں جنہوں نے اس فن میں گرانقدر تصنیفات وتالیفات انجام دیں اور عزت وشہرت کی بلندیوں پر پہنچے ۔ یوں تو ان اطباء کی ایک طویل فہرست ہے جن کا نام بنام تذکرہ اس چھوٹے سے مقالے میں شامل کرنا مشکل ہے لیکن ان میں سے چند ایک حاذق اطبائے زمانہ کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گی جو عہد نوابین میں سرزمین اودھ سے وابستہ تھے ۔

گذشتہ لکھنؤ میں عبد الحلیم شرر کے مطابق نواب سعادت خاں اور شجاع الدولہ کے دور میں دو ایک کو چھوڑ کر سبھی اودھ چلے آئے ۔ فیض آباد کی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں جتنی بھی سرکاریں تھیں ان میں سے ہر ایک میں کوئی نہ کوئی یونانی طبیب ضرور وابستہ تھا جنہیں نہایت ہی ادب واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ، ماہانہ تنخواہوں کے علاوہ انعام واکرام

سے بھی نوازا جاتا تھا، ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''نواب آصف الدولہ کے عہد میں جب لکھنؤ باکمالوں کی قدردانی کا مرکز قرار پایا تو دہلی کے بہت سے خاندانی اطبا نے یہیں توطن اختیار فرمایا اور چندوز کے بعد زبان اور شاعری کی طرح یہ فن بھی خاص یہیں کا فن بن گیا چنانچہ لکھنؤ نے حکیم مسیح الدولہ، شفاع الدولہ، مرزا محمد علی، سید محمد مرتعش، مرزا کوچک، حکیم بنّا، حکیم جعفر وغیرہ ایسے عالی پایہ وگرانقدر طبیب پیدا کئے جو سچ یہ ہے کہ فن طب کے مجتہد تھے۔ اور سلف کے سارے سرمایۂ علمی پر ان کی نظریں تھی۔ ہوتے ہوتے فن طب کو یہاں تک عروج حاصل ہوا کہ لکھنؤ کا شاذ و نادر ہی کوئی محلّہ ہوگا جس میں کوئی نامور خاندان اطباء نہ موجود ہو۔ خاص شہر کے صدہا محلوں کے علاوہ گرد و نواح کے گاؤں اور قصبوں میں بھی ہزاروں مطب جاری تھی غرضیکہ ایسے نامور طبیب لکھنؤ نے پیدا کیے جن کی مسیحا نفسی کے کارنامے آج تک بچہ بچہ کی زبان پر ہیں۔''(۱)

زبدۃ العلماء آغا مہدی ''تاریخ لکھنؤ'' میں رقم طراز ہیں:

''طب یونانی کو سلطنت اودھ نے وہ فروغ دیا کہ پہلے عنبر گنج اطباء کا مرکز قرار پایا پھر جھوائی ٹولہ اور آخر میں جوہری محلّہ خطہ یونان معلوم ہوتا تھا۔ لکھنؤ نے ایسے ایسے باکمال اطباء پیدا کیے جن کے نام رہتی دنیا تک باقی رہیں گے۔ ہند کے طول وعرض میں جو طبیب پھیلے وہ انہی باکمال اطباء کے سامنے زانوے ادب تہہ کرنے والے تھے ......اس میں کوئی شک نہیں کہ اودھ کی تہذیب، معاشرت اور تمدن کو بہتر اور مثالی بنانے میں اطبائے اودھ نے نمایاں حصہ لیا۔''(۲)

چند اطباء ایسے تھے جنہوں نے اس عہد کے اودھ کو علم طب میں عروج پر پہنچا دیا پھر ان کے شاگرد ہند کے شہروں وقریات میں پھیلے اور ایک طرح سے لکھنوی اسکول آف طب کی شہرت ہوئی۔ یہ اطباء نہ صرف مریضوں کا علاج معالجہ کرتے بلکہ طلبہ کو طب کی اہم کتب کے درس سے بھی فیضیاب کرتے اور تشخیص وتجویز کی تربیت دیتے لہذا ان اطباء نے نہایت مفید رسایل اور کتابیں بھی تصنیف کیں۔ بعض نے تو مدارس بھی قائم کیے جن میں طب کی تعلیم وتدریس کا سلسلہ جاری ہوتا۔ انہیں میں سے بعض اطباء کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں: آپ کے والد آصفی عہد میں لکھنؤ آئے۔ شاہ نصیر الدین حیدر کی سرکار میں انہیں وزارت ملی۔ دار الشفاء یونانی وایلوپیتھی ۱۸۳۲ء میں لکھنؤ قائم کیا۔ حکیم مرزا علی اکبر فرزند حاجی غوغائی کو طبی دار الشفاء کا مہتمم اور ڈاکٹر

اسٹیونسن کو ایلوپیتھی کا منتظم دارالشفاء مقرر کیا۔اودھ کے مرکزی شہر لکھنؤ میں طب یونانی کا یہ پہلا شفاخانہ تھا۔یہاں کے اطباء میں پہلے طبیب مسیح الدولہ حکیم مرزا علی خاں بہادر مرزا مظفر حسین خاں طبیب اعلی شاہی،حکیم سید محمد خاں موہانی،لکھنؤ، حکیم مرزا نظیر حسن سپرنٹنڈنٹ شاہی یونانی شفاخانہ چوک۔

حکیم حیدر حسین وحکیم صفدر حسین: یہ فن طب کے چاند وسورج سے کم نہ تھے۔دارالشفاء شاہی چوک کے طبیب اول تھے۔ علامہ حکیم احمد حسین عثمانی ملی مدرسہ طبیہ الہ آباد آپ کے ہی شاگرد تھے۔

حکیم سید جعفر حسین: ولدیت حکیم سید حیدر حسین،سکونت وکٹوریہ گنج لکھنؤ،مشہور طبیب تھے۔آپ کے جدامجد میر باقر علی شاہان اودھ کے دربار میں رسالہ داری کے منصب پر فائز تھے۔آپ کے دو بیٹے سید حیدر حسین اور حکیم سید صفدر حسین تھے۔ دونوں ہی فن طب میں ماہر تھے۔

حکیم سید صادق حسین: حکیم سید حیدر حسین کے فرزند اور حکیم سید جعفر حسین کے چھوٹے بھائی تھے۔

حکیم مولوی ابوابراہیم جعفر حسین خاں: سید محمد تقی کے فرزند تھے ۱۲۲۴ھجری میں لکھنؤ میں پیدائش ہوئی آپ کے خاندان کے اکثر بزرگ مرکز طبابت پر رہے۔

حکیم مولوی ابومحمد سید اسماعیل: جعفر حسین کے فرزند تھے۔

حکیم مرزا محمد علی: نواب امجد علی شاہ کے عہد کے مشہور طبیب تھے۔

مولوی جراح: واجد علی شاہ کے عہد میں معروف جراح جو مفتی گنج میں رہتے تھے۔

حکیم مرزا پچھو: نواب برہان الملک کے طبیب خاص تھے۔مسیح الدولہ سفیر شاہی کے جدامجد تھے۔منطق،حکمت اور طب کے عالم متبحر تھے۔علوم درسیہ کی تکمیل دوسرے علماء کے علاوہ مولانا دلدار علی مجتہد سے کی تھی۔اپنے معاصرین میں امراض متاشبہ کی تشخیص اور مشابہ ادویہ کی معرفت میں امتیاز رکھتے تھے۔نواب آصف سے نصیر الدین حیدر کے عہد تک ان کی خدمات جاری رہیں۔مسیح الملک کا خطاب بھی حاصل ہوا۔

سلطان الحکما حیات الملک مسیح الدولہ مرزا علی حسن خاں جاوید جنگ مسیح الملک کے بیٹے تھے نامور طبیب تھے ۱۲۴۹ھ میں وفات ہوئی۔

حکیم مرزا مظفر حسین: مسیح الدولہ کے بیٹے تھے ۱۲۹۸ھ میں وفات ہوئی۔تحقیقات الھیہ علی النتائج حسنیہ ملقب بہ''ہدایۃ الاطباء علی مباحث الاطباع''فارسی زبان میں لکھی۔۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۴ء میں شایع ہوئی ۲۴۴ صفحات ہیں۔ایک رسالہ نہایت الاتقان فی البیان ۱۲۹۹ھ میں لکھا۔

خان بہادر حکیم مرزا نظیر حسن: غازی الدین نے انہیں طبیب شاہی کا منصب دیا۔

مرزا کوچک: شجاع الدولہ کے مشہور طبیب تھے۔

حکیم محمد علی بنا: حکیم بنّا کا خانوادہ حکیم معالج خاں سے تعلق رکھتا ہے اور لکھنؤ میں علم و عمل کے اعتبار سے نواب اودھ کے زمانہ میں ممتاز اور سر برآوردہ رہا ہے۔ ان کے خاندان کے کئی افراد ہندوستان بھر میں شہرت کے مالک ہوئے۔ ان کے معروف شاگردوں میں حکیم مرتضیٰ محمد جو ضلع بارہ بنکی میں مطب کرتے تھے، مولوی سید محمد صاحب، حکیم نواز کریم صاحب دریا آبادی، مولوی لطف اللہ یگانہ روزگار اطباء میں سے تھے۔ حکیم محمد حسن جن کا مطب لکھنؤ میں تھا۔ محمد باقر حکیم وغیرہ۔

حکیم رضی الدین: آصف الدولہ کی سرکار میں زمرۂ اطباء میں ۵۰۰ روپیہ ماہوار پر نوکر تھے۔ ۱۲۳۳ھ میں امروہہ میں انتقال ہوا۔ آپ کے نواسے حکیم عظیم علی خاں بھی پایہ کے طبیب گذرے ہیں۔ تصانیف میں اوراق راضیہ اور جامع رضی معالجات ہیں۔

شجاع الدولہ کے دور میں حکیم مرزا جعفر: حکیم میر مرتضیٰ، حکیم باقر بن معالج خاں، مرزا محمد علی خاں، محمد اصغر حسین رضوی اصفہانی وغیرہ، اصغر حسین نواب شجاع کی وفات کے بعد آصفی عہد میں محلّہ نواز گنج میں انہیں ایک مکان عطا ہوا جہاں ان کا مطب مرجع خاص و عام تھا۔

حکیم امام بخش بے مثل طبیب اور علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر تھے۔ آداب الاطباء اور خلاصۃ الطب آپ کی تصانیف ہیں۔

حکیم محمد علی رحیم: نصیر الدین حیدر بادشاہ کے طبیب خاص تھے۔

حکیم مولوی علی حسین: عہد امجدی کے مشہور طبیب تھے۔

حکیم آغا شکوہ: عہد واجدی کے طبیب تھے۔

حکیم سید محمد حیدر (ابن سید فیض علی) حاذق طبیب عہد واجد تھے۔ غدر کے بعد شاہ کے ہمراہ مٹیا برج کلکتہ بھی گئے۔ اور تمام عمر بادشاہ کی خدمت میں گذاری۔

شیخ عابد حسین عرف عمدو جراح: جراحی وحجامی دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔

علامہ کنتوری: علامہ حکیم مولوی سید غلام حسنین کنتور ضلع بارہ بنکی علم طب میں ماہر تھے۔ ۱۲۵۴ھ سال جلوس محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے عہد میں لکھنؤ آئے ور مدرسہ شاہی میں داخل ہوئے۔ طابت کے ساتھ تدریسی خدمات بھی انجام دیتے تھے۔ میرٹھ اور گوالیار میں آپ نے طب جسمانی وطب روحانی کے ذریعہ امراض کے علاج کیے اور کامیابی حاصل کی۔ فکر معاش کے سلسلہ میں ایک مرتبہ منشی نولکشور سے لکھنؤ ملاقات بھی کی۔ وہ بھی آپ کے علم وفضل سے خاصے متاثر تھے لہذا اعجاز خسروی کی شرح کا کام آپ کے سپرد کیا۔ جو آپ نے بڑی محنت سے انجام دیا۔ آگے چل کر کامل الصناعت مصنفہ ابوالحسن علی ابن العباس مجوسی اور القانون فی الطب مصفی شیخ الرئیس ابوعلی حسین بن عبداللہ بن سینا کا مکمل ترجمہ تشریحات کے ساتھ

فرمایا جوکہ منشی نولکشور سے شایع ہوئے۔طب کے طلباء کوان سے خاطر خواہ فائدہ ہوا۔اس کے علاوہ ان کتابوں کے عربی سے اردو تراجم بھی کئے۔طب کے علاوہ علم کیمیا سے بھی مولانا کو خاص دلچسپی تھی۔علامہ دینی تعلیم کے ساتھ صنعتی تعلیم پر بھی زور دیتے تھے۔آپ نے بہت جگہوں پر سفر کیے جن کا تفصیلی ذکر ''سفرنامہ علامہ کنتوری'' میں ملتا ہے۔(دھولپور، میرٹھ، جلالی، مظفرنگر، کلکتہ، بنارس، پشاور، جموں، بڑودہ، پٹیالہ وغیرہ) آپ کی تصنیفات کی ایک لمبی فہرست ہے جن میں ادبی کتابوں کے علاوہ تقریباً چھ کتابیں علم طب سے متعلق ہیں کل کتابیں ۲۰ ملتی ہیں۔طب میں ترجمی وشرح قانون فی الطب، کامل صناعت ترجمہ وشرح، ترجمہ قانون بچہ، ترجمہ رسالہ قبریہ ترجمہ وتلخیص جالینوس، مجربات علامہ کنتوری وغیرہ۔

مخلص الدولہ حکیم سید سرفراز حسین کنتوری: آپ عالم اور طبیب تھے مخلص الدولہ کا خطاب واجد علی شاہ اودھ کی جانب سے عطا ہوا تھا۔آپ کے والد اور جد امجد بھی عمدہ عہدوں پر فائز رہے۔تصانیف میں تفسیر فی علاج البواسیر، ماعون لمرض الطاعون، رسالہ در بیان موتی چہرہ، ملیریا کا علاج بطریق یونانی، رسالہ در بیان قیامت بہ قواعد فلسفہ وسائنس اسلامی۔

حکیم محمد صدیق سخنور: ۱۷۲۷ء میں پیدا ہوئے۔عالم شاعر ہونے کے علاوہ علم طب میں بھی مہارت حاصل کی۔اور مطب بھی شروع کیا۔

مسیح الوقت حکیم سید محمد بقاءاللہ خان بہادر مخدوم زادہ: (متوفی ۱۷ شوال ۱۲۶۴ھ) فن طب اور علم ہیئت میں ماہر تھے آگرہ کے دیوان تھے۔آگرہ میں کٹرہ بقاخان آپ کے نام سے ہی منسوب تھا۔

حکیم جان علی شاہ: ابن رمضان علی شاہ ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوئے۔آپ کا تعلق جونپور سے تھا طب اور دیگر علوم جونپور کے نامور علماء سے سیکھے۔طبعاً فقر ودرویشی کی جانب مائل تھے۔مصنف عامل تھے تمام امراض آسیب اور ارواح خبیثہ کا قوت روحانی کے ذریعہ علاج معالہ کرتے۔ایک کامیاب حکیم تھے۔لوگ دوا اور دعا دونوں کے لیے آپ کے پاس آتے۔۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا۔آبائی تکیہ جان علی شاہ میں دفن ہوئے۔

مولوی حکیم ایوب خاں: آپ کا تعلق رامپور سے تھا۔علم طب میں اچھی استعداد تھی۔

حکیم انچھا رام: رامپور سے (۱۲۲۵-۱۲۵۶ھ) مشہور طبیب تھے۔

حکیم دوست محمد خاں: جناب نواب سید فیض اللہ خاں صاحب رامپور کے عہد میں ۱۱۸۸ھ تا ۱۲۰۸ھ) تھے۔حکیم بایزید کے ہمعصر تھے۔

حکیم بایزید: ولد شاہ رحمت اللہ ولد حافظ عربی کے عالم اور طب میں ارسطوی وقت تھے۔

حکیم فتح علی خاں: رامپور میں ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے علم طب آپ کے خاندان میں کئی پشت سے چلا آرہا تھا اس لئے طب پر زیادہ توجہ صرف کی۔

حکیم محمد حکمت اللہ: امروہہ میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ کتب طب حکیم علی حسین خاں لکھنوی سے پڑھیں۔ ماہر طب تھے۔

نواب حکیم تفصیل حسین خاں: آپ کو علم طب سے بیحد شغف تھا۔ نواب سعادت کے اتالیق تھے پھر وزیر اعظم ہوئے (آصف الدولہ) ان کی علمی قابلیت کا عالم یہ تھا کہ اردو، فارسی اور عربی زبانوں کے علاوہ انگریزی، لاطینی اور عبرانی زبانیں بھی جانتے تھے۔ انہیں ہردوئی میں بارہ مواضعات کی جاگیر اور دربار شاہی سے خاں مدرسہ کا موروثی خطاب ملا تھا۔ یہ ادیب تھے جید عالم تھے۔

حکیم سید علی حیدر زیدی صاحب سکندر پور فیض آباد سے تھے۔

حکیم شفائی خاں: نواب شجاع کے عہد میں حکیم محمد راشد بن عبدالشاہد خاں معروف بہ شفائی خاں فاضل اور طبیب حاذق تھے۔ نواب آصف کے بھی طبیب خاص رہے۔ آپ کے تصانیف میں فوائد شفائی، شرح اسباب وعلامت، شفاء الجمیل، جراحۃ المعاندین، ۸۰ سال کی عمر میں ۱۳۲۱ھ میں لکھنؤ میں وفات ہوئی۔

اطبائے قصبہ جلالی ضلع علیگڑھ یوپی میں قطب العارفین حکیم سید شاہ خیرات علی ہمدانی نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ اور ایک معروف طبیب بھی تھے۔ نواب شجاع الدولہ کے عہد میں آپ کے اچھے تعلقات رہے۔ نواب فرخ آباد اور نواب مظفر ...... بنگش کے درباروں سے بھی آپ تاحیات وابستہ رہے۔ یہاں کے دیگر اطبا میں حکیم سید بہاء الدین حسین ہمدانی، سید جعفر حسین، حکیم سید زائر حسین صاحب، سید محمد شجاع الدین حسین اور سید سردار حسین وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔

منابع و مآخذ:

۱۔ خزانہ عامرہ، غلام علی آزاد بلگرامی
۲۔ تاریخ معدن السعادت، مؤلفہ سید سلطان علی حسین صفوی ص ۳۹۱
۳۔ تواریخ اودھ، سید کمال الدین حیدر حسینی ص ۶۶/۵۶
۴۔ تواریخ اودھ، سید کمال الدین حیدر حسینی ص ۶۶/۵۶
۵۔ سوانح علامہ کنتوری ص ۱۰۳
۶۔ تذکرۂ بی بہا فی تاریخ العلماء، مولانا سید محمد حسین نوگانوی ص ۳۵۶
۷۔ رموز الاطباء، حکیم فیروز الدین جلد ا ص ۱۳۰
۸۔ قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ، سید اسرار حسین خان
۹۔ تاریخ لکھنؤ، سید آغا مہدی
۱۰۔ گذشتہ لکھنؤ، عبدالحلیم شرر
۱۱۔ تذکرہ علمائے فرنگی محل
۱۲۔ تذکرہ مشاہر کاکوری
۱۳۔ تاریخ بلگرام، قاضی شریف الحسن بلگرامی
۱۴۔ تاریخ سندیلہ، درگاہ پرشاد میر سندیلوی
۱۵۔ تذکرہ علمائے ہند، رحمان علی
۱۶۔ تذکرہ اطبائے اودھ، حکیم سید کمال الدین
۱۷۔ لکھنؤ کی تہذیبی میراث، سید صفدر حسین

☆☆☆

ڈاکٹر محمد قیصر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ فارسی
علی گڑھ مسلیم یونیورسیٹی، علی گڑھ

انقلابِ اسلامی کے بعد ایرانی شاعری میں تحولات

انقلابِ اسلامی ایران میں رونما ہونے والا بیسویں صدی کا سب سے حیرت انگیز واقعہ ہے۔اس انقلاب کی آواز اسلام اور آزادی تھی۔ بادشاہ وقت رضا شاہ پہلوی کی استبدانہ اور جابرانہ نظام حکومت سے عوام پریشان تھی۔رضا شاہ پہلوی اور اس کے باپ کے ستاون سالہ عہد حکومت میں تقریباً دس لاکھ لوگ حکومت کے ہاتھوں شہید کر دیئے گئے۔ پہلوی حکمرانوں نے اپنے نام نہاد شان وشوکت کے لئے سرزمین ایران کو امریکہ اور اسرائیل کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔لہٰذا ایرانی عوام اپنے عظیم قائد امام خمینی کی ہدایت پر اس ظالم اور جابر حکومت کے خلاف میدان میں نکل پڑی۔لوگ حکومت وقت کے خاتمے اور اسلامی سلطنت کے قیام کے لئے آمادہ ہوگئے۔'اللہ اکبر خمینی رہبر'، 'اللہ واحد خمینی قائد' اور 'لا الہ اللہ خمینی روح اللہ' کے نعروں ایران کی فضا گونج اٹھی جس کے نتیجہ میں بادشاہ وقت نے امام خمینی کو جلاوطن (چودہ سال عراق اور دو سال پیرس) کر دیا لیکن امام خمینی وہیں سے ایرانی عوام کی قیادت کرتے رہے۔بالآخر ایک فروری ۱۹۷۹ء کو ایرانی عوام کا ہردلعزیز رہنما امام خمینی کی سولہ سال کی جلاوطنی کے بعد وطن واپسی ہوئی۔

ایران میں انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد حکومتی نظم ونسق کے لئے جب یرانی عوام کی رائے لی گئی تو تقریباً ننانوے فیصدی لوگوں نے اسلامی جمہوریہ کے حق میں رائے دی۔ چنانچہ عوام کی خواہش کے مطابق اسلامی جمہوریہ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور قرآن وسنت کی روشنی میں اسلامی آئین مرتب کیا گیا اور ایک پارلیامانی نظام حکومت عمل میں آیا۔

اسلامی جمہوریہ کے قیام کے بعد ایران نے اپنی تمام اندرونی اور بیرونی حکمت عملی کو اسلامی اصولوں پر مرتب کیا۔امریکہ اور اسرایل مما لک سے تمام تعلقات منقطع کر لئے گئے تمام سیاسی قیدیوں کو جیلوں سے رہا کر دیا گیا۔غاصبوں سے اموال لے کر محروموں میں تقسیم کر دیا گیا۔تمام غیر اسلامی اور غیر شرعی رواجوں کا خاتمہ کر دیا گیا۔سنیما، موسیقی، عریانی، شراب نوشی اور فحاشی پر سخت پابندی عائد کر دی گئی۔ریڈیوں اور ٹیلی ویژن پر رقص اور موسیقی جیسے پروگرام یکسر بند کر دیا گیا اوران کی جگہ شرعی احکامات واسلامی تعلیمات پر مشتمل پروگرام نشر کئے جانے لگے۔

تہذیب وتمدن اور فرہنگ وثقافت میں اثر ونفود کا عمل ایک فطری عمل ہے۔ادب اور سماج ایک ہی سکہ کے دو

پہلو ہیں۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں اوران میں دو جانبہ رشتہ ہے۔ایک طرف ادب سماج پر اپنا اثر ڈالتا ہے تو دوسری طرف سماج کا نفوذ بھی قبول کرتا ہے۔ایران کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ پتا چلتا ہے کہ ابتداء سے ہی سیاسی وسماجی حادثات اور واقعات نے ادب پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔جس طرح کسی قوم کے تہذیب وتمدن کو سمجھنے کے لئے اس قوم کا ادبی مطالعہ ضروری ہے اسی طرح کسی ادب کو سمجھنے کے لئے اس مخصوص سماج سے واقفیت بھی ضروری ہے۔

بیشک انقلابِ اسلامی کا شمار بیسویں صدی میں ایران میں رونما ہونے والے سیاسی واقعات میں اہم ترین واقعہ ہے۔ مذکورہ انقلاب نے ڈھائی ہزار سالہ شہنشاہیت کا تختہ الٹ دیا اور ایک ایسی الگ راہ کھولی جس کے ذریعے ملتِ ایران اپنے رہبر اور مرد مومن کے احکام کی پیروی میں خدا اور دینِ اسلام کی طرف متوجہ ہوئے۔اس انقلاب میں ملتِ ایمان کو نہ صرف صدیوں پورانی فکری اور سیاسی قید سے مبرہ کیا بلکہ سیاسی تشخص بحال ہوئے اور چودہ سوسالہ اسلامی اقدار کو نئی زندگی ملی۔اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی معاشرے میں سیاسی، ادبی، فنی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں اور فراموش شدہ اسلامی اقدار کا احیا ہوا جس کا اثر اس عہد کے شعر وادب پر پڑنا لازم تھا۔انقلابِ اسلامی کے بعد جو تبدیلیاں فارسی ادب میں دیکھنے کوملتی ہیں ان میں جنگ، شہادت طلبی، غازیانِ اسلام کی رزم آرائیاں وغیرہ موضوعات قابلِ ذکر ہیں جو نئے اشعار کی تخلیق کا باعث بنے اور یہ ایک خاص رنگ اور انداز و بیان سے داخل ہوئے۔درحقیقت انقلاب اسلامی کے بعد کی شاعری نفسِ امارہ کا بیان نہیں بلکہ نسیم رحمانی اور صور ربانی کی مصداق ہے۔اگر چہ انقلابِ اسلامی کے بعد کی شاعری مختصر ہے لیکن قابلِ قدر اور نقد وتجزیے کی مستحق ہے۔

جن گونا گوں عناصر سے شاعری تشکیل پاتی ہے انہیں صوری اور معنوی دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ دونوں ہی حصّے نصرف کلام کو اہمیت بخشتے ہیں اور تاثیر میں اضافہ کرتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔اس بات کے پیش نظر لفظ اور معنی ایک دوسرے سے جدا نہیں۔الفاظ شاعر کے لئے اظہار کا وسیلہ ہیں اس لئے نقدِ سخن کی بحث، صوری اور معنوی شکل میں تقسیم ہوتی ہے۔مجملہ انقلابی اسلامی کے بعد کی شاعری کو ان ہی دو پہلوؤں سے جائزہ لینا چاہئے۔لہٰذا ہم اس مقالہ میں انقلابی اسلامی کے بعد کی شاعری میں رونما ہونے والی صوری تبدیلیوں کو موضوع بحث بنائنگے۔

صوری یعنی وزن، قافیہ اور موسیقی کے اعتبار سے انقلاب اسلامی کے بعد کی شاعری میں حیرت انگیز تبدیلی نظر آتی ہے جو قبل از انقلاب دیکھنے کو نہیں ملتی۔

ا۔اوزانی تحولات

انقلاب اسلامی سے قبل چند لوگ شاعری کو ایک ایسا کھلونا بنالیا تھا جو شعور کے ساتھ کی گئی شاعری کے برخلاف ہر چیز پر مبنی تھا۔اصیل متعہد شاعری کے نام پر غیر مفہوم الفاظ اور جملے پیش کیے جاتے تھے۔وزن اور قافیہ جیسے شعری عناصر کو

کلام سے متروک کر دیا گیا تھا جو دراصل قاری پر اثرات مرتب کرنے میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔ بالفاظ دیگر اس دور کے شعراء نے شاعری کو ہر قسم کے قواعد وضوابط سے آزاد کر دیا تھا جیسے ہم شعر آزاد یا شعر سپید کے نام سے جانتے ہیں۔ انقلاب اسلامی کے بعد کے فنکاروں نے اپنے ماضی اصیل، ثقافتی اور تہذیبی قدروں کو زندہ کیا۔

انقلابِ اسلامی کے بعد کی شاعری میں تبدیلی دراصل وزن کی طرف رجوع ہے۔ اس عہد کے شعرا نے اپنے کلام کو موزوں اور مناسب جامہ پہنایا۔ اس کے علاوہ بعض نادر اوزان کو جو فارسی شاعری میں مستعمل تھے اس عہد کے شعرا نے نئے طریقے سے استعمال کیا۔ ان میں سے چند اوزان کا مختصراً ذکر درجہ ذیل ہے۔

(الف)۔ نادر اوزان:

انقلابِ اسلامی کے بعد ایران میں بعض شعرا میں نئے اوزان استعمال کیے ہیں جو فارسی عروض میں نادر اوزان کے نام سے معروف ہیں۔ محمود شاہرخی نے اسلامی جمہوریہ کے قیام اور شہنشاہی نظام کے تخریب پر ایک قصیدہ کہا تھا جس میں نادر اوزان کو استادانہ طریقے پر استعمال کیا ہے جس کا وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فع ہے مطلع ملاحظہ ہو:

یاد آرم چو از آن روز غم افزا من
از تف آه شوم شعلہ سراپا من

اس کے علاوہ منوچہری اور ملک اشعرا بہار کے قصیدے بغد جنگ، کے طرز پر مہرداد نے حماسہ شہدا کے نام سے ایک قصیدہ کہا ہے جو نادر اوزان کی فہرست میں آتا ہے۔ قصیدے کا وزن ہے مفاعلن مفاعلن مفاعلن مفاعلن ہے۔ چند بیت پیشِ خدمت ہیں:

فری شہید و عز و اعتلای او
کرامت و کمال و کبریای او
ولایت و سرود جانفزای او
شہادت و حماسۂ ولای او

کتابِ سواران آفتاب میں ایک رزمیہ (نظم) کہی ہے جس کے وزن مفتعلن فاعلات مفتعلن فع ہے مطلع ملاحظہ ہو:

تیغ توانائی از نیام بر آرید
چشمۂ خورشید از ظلام بر آرید
باب توسل بہ اعتصام گشودند

دست توسل به احترام بر آرید

علامہ طباطبائی کی شخصیت کی عظمت پر ایرانی عوام جان قربان کرتی ہے۔لہٰذا ان کی وفات پر دو معاصر شعرا حمید سبزواری اور علی معلم نے ناصر خسرو کی تقلید میں پردرد قصیدہ کہا ہے جس کا وزن مفعول فاعلات مفاعیل فع ہے۔حمید سبزواری کے قصیدے کا مطلع مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

بگذار تا دو دیدۂ در افشان کنم
دمساز نال نالہ فراوان کنم

اسی وزن میں علی معلم کے قصیدہ کا ایک شعر ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

شاید کہ حال و کار دگر گون کنم
ھرچ آن غمی ترست هم ایدون کنم

اس کے علاوہ مرتضی نوربخش اور دیگر شعرا نے بحر رجز (مستفعلن مستفعلن مستفعلا تن) کے وزن پر اشعار کہے ہے جو نادر اوزان میں شمار ہوتے ہیں۔مرتضی نوربخش کی ایک غزل کا یہ مطلع ملاحظہ ہو:

صبح است و بربام ظفر پیر جماران
در دست دارد پرچم امید واران

(ب)۔نئے اوزان:

انقلاب اسلامی سے قبل ایران میں رزم نگاری کے لئے بحر متقارب مستعمل ہونے والی سب سے معروف بحر ہے۔شاہنامہ فردوسی، گشتاسبنامۂ دقیقی اور گرشاسبنامۂ اسدی طوسی وغیرہ اس کی بہترین مثال ہے۔لیکن انقلاب اسلامی شعرا نے اپنے رزمیہ موضوعات کو بیان کرنے کے لئے ایک نئے وزن کا انتخاب کیا جیسے ہم بحر رجز مسدس مرفل (مستفعلن مستفعلن مستفعلا تن) کے نام سے جانتے ہیں۔اگر چہ انقلاب اسلامی کے شعرا نے اس وزن کو مثنوی نگاری کے لئے موزوں سمجھا نیز غزلیں اور قصیدے بھی کہے گئے ہے۔علی معلم کی رزمیہ مثنوی 'این فصل را با من بخوان' اور پرویز بیگی حبت آبادی کی مثنوی 'شہر میعاد گل خون' اس کی بہترین مثال ہیں۔نمونہ کلام بالترتیب اس طرح ہے:

(۱)

همگامۂ میعاد خونینی دوباره نیست
باور کن اینك رجعت سرخ ستاره نیست
یوم سیاه شب سرا را پر بریدند

شب را بہ تیغ فجر خونین سر بریدند
در جان عالم جوشش خون حسینی است
اینک قیام قائم مہدی خمینی است

(۲)

آن جا بہاران راخزان درپای دارد
تاریخش اندر بستر خون جای دارد
آن جا شہیدان شعر خون رامی سرایند
چون رہروان عشق سریر عرش سایند

(ج)۔وزن اور معنی میں ہم آہنگی:

قاری پر اشعار کا خاطر خواہ اثر ڈالنے کے لئے شعرا موضوع کی مناسبت سے ایسے وزن اور قالب کا انتخاب کرتے ہیں تا کہ ان کا کلام از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق بن جائے۔انقلاب اسلامی کے بعد شعرا نے بھی وزن اور معنی کے درمیان مناسب ہم آہنگی کو ملحوظ رکھا ہے۔نمونہ کلام کے طور پر مہرداد کے اشعار ملاحظہ ہو:

(۱)

آفتابا بتاب اندرین دشت — از افق تا بہ سر منزل من
چون شقایق نگر بر دمیدہ — خون پیوستگان دل من

(۲)

زوزۂ لاشخوران بعشی — در فرا راہِ ببر دمان چیست
باش تا نعرہ از دل بر آرد — تا ببینی از این سگ، اثر نیست

(۳)

ہفتاد و دو شاہد بہشتی — از کوچہ خاک کہ پیر رفتند
با نغمۂ آسمانی عشق — در ہفتم ماہ تیر رفتند

(د)مثنوی گوی میں وزن کی طوالت کا رجحان:

فارسی ادب میں طویل مضامین اور داستان کے لئے مثنوی صنف بہت زیادہ مستعمل ہے۔قصیدہ اور غزل کے مقابلے میں مثنوی میں حروف ہجا کم پائے جاتے ہے۔عام طور سے مثنوی میں حروف ہجا کی تعداد گیارہ یا اس سے کم پائے

جاتے ہے جس کی مثال شاہنامہ فردوسی، خمسۂ نظامی، حدیقۂ سنائی، مثنوی معنوی مولوی، بوستان سعدی اور ھفت اورنگ جامی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔لیکن انقلاب اسلامی کے بعد بعض شعرانے مثنوی گوی کے لئے قصیدہ اورغزل کے برابر حروف ہجا کا استعمال کیا ہے نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

فسانہ گشت و کہن یاد رستم دستان
از آن حماسہ کہ بسرود خلق خوزستان
حکیم توس سزد سر زخاک بردارد
خداینامہ بہ اروند رود بسپارد
بشوید از ہمہ دیوان حدیث شاھان را
طراز نامہ کند نام داد خواھان را
کہ رزم ساحل اروند نقش جیحون شست
سیاہ نامۂ تاریخ رایم خونی شست

(ہ)۔رباعی کی طرف رجوع:

فارسی شاعری میں مختصر موضوعات کے لئے رباعی سب سے مناسب صنف ہے۔انقلاب اسلامی کے بعد اکثر شعرانے اس صنف میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔قیصر امین پور کی یہ رباعی پیش خدمت ہے:

زین شہر، ہمیشہ بوی خون می آید
زین کوی، ہمیشہ جوی خون می آید
ھرچند ھنوز خون پیشین تازہ ست
بس خون کہ بہ شستشوی خون می آید

نیز حسن حسینی کے رباعی جس کا موضوع شوق شہادت ہے ملاحظہ ہو:

صحرای خطر گام مرا می خواند
صہبای سحر بام مرا می خواند
وقت خوش رفتن است، ھان گوش کنید!
از عرش کسی نام مرا می خواند

ناصر میر شکاک کی 'سوگنامہ' سے ایک رباعی نقل کی جاتی ہے۔

تو پیوند بهار و باغ بودی
تو ابهام دل افلاک بودی
دل آئینه شرم از دیده ات داشت
ز لال چشمه های پاک بودی

۲۔قوافی تحولات

قافیہ کسی شعر کا نقطۂ عروج اور زیبائش ہے جو کلام کی فصاحت و بلاغت میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔انقلاب اسلامی کے بعد اکثر شعرا نے قافیہ کی طرف خاص توجہ فرمائی۔نمونے کے طور پر محمد علی مردانی،سیمین دخت وحیدی،حمید سبزواری،مہرداد اور قیصر امین پور کے ایک ایک شعر بالترتیب نقل کئے جارہے ہیں:

(۱)

بهر تولد دگر این ققنسان مست　　رفتند در دهانهٔ آتش به کام خون

(۲)

شگفته بر لب مشتاق من ترانهٔ صبح　　که مرغ جان برسانم به آشیانهٔ صبح

(۳)

نیلی کنم ز سیلی رخساره را　　وانگه به مویه چاك گریبان کنم

(۴)

لقای دوست خوابد و بلای وی　　زهی شهید و ایزدی لقای او

(۵)

باید ز بام و در بیاریم　　تا درمیان گور بخوابانیم

۳۔موسیقی الفاظ کا استعمال

وزن اور قافیہ کا عمدہ استعمال معنی کی بہتر ترسیل و تفہیم میں معاون ہوتا ہے۔ایک کامیاب شاعر اپنے گونا گون احساسات و افکار کو دوسروں تک بخوبی منتقل کرنے کے لئے الفاظ و ترکیبات کا استادانہ استعمال کرتا ہے۔الفاظ کی حسن ترکیب شعر میں ہم آہنگی اور دلکشی پیدا کرتا ہے۔شعر کی بافت میں الفاظ کی تکرار،ہجا،اصوات اور صامت وغیرہ موسیقی کے باعث سمجھے جاتے ہیں۔

(الف)۔لفظ کی تکرار:

شعر میں اگر ایک لفظ کی تکرار صحیح طریقے سے استعمال کیا گیا ہو تو کلام میں ترنم پیدا ہو جاتا ہے اور تفہیم معنی میں مدد ملتی ہے۔ انقلاب اسلامی کے بعد ایران میں اکثر شعرا نے اس موضوع پر خاص توجہ دی ہے۔ نمونۂ کلام کے لئے سپیدہ کاشانی کا یہ اشعار ملاحظہ ہو:

شبی دراز، شبی مرگ زا، شبی دلگیر
کشیده بود بلندای نور در زنجیر
سوار ثانیه ها در غبار می آمد
سیاه جامه به تن، سوگوار می آمد

اس شعر میں لفظ 'شب' ظلم واستبداد اور گھٹن کے لئے استعارہ ہے۔ لفظ 'شب' کی تکرار شعر کے معنی میں اضافہ کر کے دلکش اور موثر بنا دیتا ہے۔ ایک جگہ قیصر امین پور نے لفظ 'لالہ' کی تکرار اس استادانہ طریقے سے کیا ہے کہ شعر میں موسیقی پیدا ہو جاتی ہے اور معنی کی تفہیم میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نمونہ کلام مولاحظہ ہو:

زباغ لاله چه گویم زداغ لاله چه مویم
که جای ناله و غم نیست در عزای شهادت

محمد علی محمدی ایک جگہ لفظ 'مست' کی تکرار کر کے عوام کی شادمانی اور مستی کی عکاسی کی ہے۔ نمونہ کلام پیش خدمت ہے۔

من مست بی پیاله و چشمان یار مست
گل مست و سرو مست و به آواهزار مست
هر سو فتاده مستی و ساقی به جانبی
خود اوفتاده بانگه پر خمار مست
ره بست تا به دزد زمستان بهار خون
شد عالمی ز مرحمت کردگار مست

(ب)۔ صامت کی تکرار:

انقلاب اسلامی کے بعد صامت کی تکرار بھی اکثر شعرا کی توجہ کا باعث رہی ہے جس سے شعر کی دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔ فاطمہ راکعی نے امام خمینی کی عقیدت میں ''گل آفتاب'' کے نام سے ایک نظم کہی ہے اور اس میں انہوں نے 'بہ' کا استعمال اس طرح سے کیا ہے کہ سخن میں ترنم پیدا ہو جاتا ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

به آرزو، به تصور، به خواب می ماند
به پرسشی که ندارد جواب، می ماند

علی معلم کا ایک شعر ذیل میں پیش کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے سین، شین اور صاد کی تکرار اس طرح سے کی ہے کہ شعر میں جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے اور تفہیم معنی میں معاون ہو جاتا ہے:

مردی، شکوه شوکت عیسی شنیده
موسی صفت بر سینهٔ سینا تنیده

اسی طرح سپیدہ کاشانی نے ایک شعر میں ذ اور ز کی تکرار اس حسن خوبی سے کیا ہے کہ شعر کے معنی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے:

ذره شد در پرتو خورشید جان افروز عشق
در سماع سرخ سربازان حق از سر گذشت

منجملہ انقلاب اسلامی کے بعد کی شاعری میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان میں چند تحولات کا ذکر ہم نے اپنے اس مقالہ میں کر دیا ہے جو قاری کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔اس دور کی شاعری میں اوزان وقوافی کی تحولات کے ساتھ ساتھ الفاظ کی موسیقی کا مظاہرہ اتنا وسیع پیمانے پر ہوا ہے کہ ہر ایک کا ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں ہے۔لہٰذا اختصار سے کام لیتے ہوئے اپنی بات کو منقطع کرتا ہوں۔

☆☆☆

ڈاکٹر نیلوفر حفیظ
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ عربی و فارسی
الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد

عصر حاضر میں داراشکوہ کے صوفیانہ کلام کی اہمیت

تاریخ گواہ ہے کہ مغل شہنشاہ صاحب سیف، کشورستان، ہوشمند سیاستدان اور بہترین ناظم حکومت ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے علم پرور، ادب نواز اور نکتہ سنج بھی رہے ہیں جہاں ایک طرف ان شہنشاہوں نے صفحۂ قرطاس پر حدود سلطنت کی وسعت و کشادگی کے لئے شجاعت و ہمت کی ناقابل فراموش داستانیں نقش کیں تو وہیں دوسری طرف شعر و شاعری کی محفلوں کو روشن و تابناک بنائے رکھنے اور علم و ادب کی ترویج و اشاعت کے لئے بھی کچھ کم کارنامہ ہائے گرانقدر انجام نہیں دیئے ہیں، مغل شہنشاہوں کے ساتھ ساتھ ان کے امراء، وزرا اور شہزادے و شہزادیاں بھی علم و ادب کے بڑے قدردان اور دلدادہ رہے ہیں جن کے علمی و ادبی کارنامے اس جریدۂ عالم پر ثبت ہو چکے ہیں، جس مغل شہزادے کو علمی دنیا میں نمایاں مرتبہ اور انفرادی مقام حاصل ہوا وہ فرمانروائے خاندان مغلیہ شاہ جہان کا لخت جگر اور اورنگ زیب عالمگیر کا برادر حقیقی شہزادہ محمد داراشکوہ متخلص بہ قادری ہے جس نے اپنی بے پناہ خداداد علمی صلاحیتوں کا کے سبب پوری علمی دنیا سے خراج تحسین وصول کیا اور اپنی بے پناہ صلاحیتوں ولیاقتوں کی بنا پر بڑے بڑے علماء و فضلا سے اپنی اہمیت و حیثیت کا لوہا منوایا۔

شہزادہ داراشکوہ ایک عالم بھی تھا اور عامل بھی، مفکر بھی تھا اور مدبر بھی، اہل دل بھی تھا اور اہل نظر بھی، حالانکہ بعض لوگ اس عظیم اور نابغہ روزگار شخصیت کو مرتد اور کافر کہہ کر ہمیشہ اس کو برا ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں لیکن اگر چشم بینا کو وا کرتے ہوئے اس دور کے سیاسی حالات کا محاسبہ و معائنہ کیا جائے تو احساس ہوگا کہ حقیقت اس سے قدرے مختلف ہے اور دارا کو کافر و مرتد کہنے والے لوگ درحقیقت تعصب و تنگ نظری کا شکار ہیں جس کا بظاہر کوئی علاج نہیں ہوسکتا بہر حال ان مباحث سے قطع نظر میرا مقصد داراشکوہ کی فارسی شاعری کی معنویت و اہمیت پر اظہار خیال کرنا ہے لہٰذا میں اپنے اصل مقصد کی طرف آتی ہوں جیسا کہ ہم سب واقف ہیں کہ داراشکوہ کی جملہ تصانیف کا اصل موضوع تصوف و روحانیت و معرفت ہے لیکن اس شہزادے کے صوفیانہ عقاید، عارفانہ تصورات اور قلندرانہ خیالات کا حقیقی رنگ اگر اپنی پوری آب و تاب اور شدت وحدت کے ساتھ کہیں جلوہ گر ہوتا ہے تو وہ اس کا فارسی منظوم کلام ہے جس میں وہ ایک علمی ادارے، ادبی

انجمن اور صوفیانہ عقاید کا منبع و مرکز نظر آتا ہے اس نے اپنی شاعری کے ذریعے اصلاح فکر اور پاکیزگی نفس کے لئے جو کوششیں ہمایوں اختیار کیں اس کی نظیر شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے جیسا کہ خود داراشکوہ بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ شاید سحابی اور مغربی نے اس قدر اسرار و رموز کی پردہ کشائی نہیں کی ہے جس قدر راز ہائے سربستہ ''قادری'' نے بیان کر دیئے ہیں:

نہ سحابی نہ مغربی گفتند
قادری گفت این قدر اسرار

داراشکوہ کی زندگی میں اگر سیاسی ناکامیاں، ذاتی محرومیاں، عزیزوں کی بے وفائیاں، قسمت کی ستم ظریفیاں اور وقت کی نامہربانیاں وارد نہ ہوئیں ہوتیں تو یقیناً وہ اپنی علمی صلاحیتوں اور ادبی لیاقتوں کے پیش نظر اس صفحہ کائنات پر وہ عظیم سیاسی اور علمی کارنامے رقم کر جاتا جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی تھی لیکن وقت کی نامساعدی اور حالات کی ناسازگاری نے اس شہزادے کم نصیب کا اصل مقام و مرتبہ متعین ہونے ہی نہیں دیا، بہر حال تاریخ نویسوں کے نزدیک بھلے ہی داراشکوہ ایک شکست خوردہ، ناکام اور نامراد ولیعہد کی حیثیت متعارف ہو لیکن ادبی دنیا بالخصوص صوفیانہ ادب کا مطالعہ کرنے والے دانشوروں کی نظر میں وہ ایک صوفی مشرب، نیک خصلت اور فرشتہ خصلت انسان کی حیثیت سے جانا جاتا ہے جناب وارث کرمانی نے دارا کے بارے میں اپنی رائے قلم بند کرتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے:

> ''وہ اپنے دور کا ایک صوفی ہی نہیں بلکہ ایک عالم بھی تھا، شہزادگی کا داغ اگر اس کی پیشانی پر نہ ہوتا اور ناخوش گوار حالات رونما نہ ہوتے جو اس کی شہادت کا سبب ہوئے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ داراشکوہ نہ صرف اپنے دور بلکہ بعد کے تاریخی ادوار میں بھی دنیائے علم و ادب اور فقر و تصوف کے دلدادوں سے خراج تحسین وصل کرتا''۔[۱]

داراشکوہ کو ابتداء ہی سے عارفانہ افکار و عقاید اور صوفیانہ اسرار و رموز سے غیر معمولی دلچسپی تھی شاہ جہان جب بھی بزرگان طریقت کی خدمات میں حاضر ہوتا تھا تو داراشکوہ کو بھی اپنے ہمراہ لے جاتا تھا چنانچہ کم عمری سے ہی دارا کے دل و دماغ پر حکمت و معرفت اور تصوف کے گہرے نقوش مرتب ہونے لگے تھے اور گزرتا وقت ان نقوش کو اور زیادہ نمایاں، واضح اور راسخ کرتا چلا گیا اور دن بہ دن اس کا مزاج مادیت سے بیزار روحانیت کی طرف مایل ہوتا چلا گیا وہ اور اس کی علمی تشنگی شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی وہ اس تشنگی کی تسکین کے لئے اپنے عہد کے نامور و مشہور علما، عرفا، پنڈتوں اور جوگیوں وغیرہ سے کسب فیض کرتا اور حقایق و معارف کے بحر لا متناہی میں غواصی کرتے ہوئے کچھ قیمتی موتی چن لینے کی

آرزو میں ہمیشہ مستغرق و متحرک رہتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سلطنت کے امور دھیان مرکوز کرنے کے بجائے متصوفانہ اسرار ورموز کی پردہ کشائی پر اپنی پوری توجہ صرف کر دی مالک حقیقی نے اس عظیم شہزادے کی ذات میں کچھ ایسے جوہر ودیعت کر دیئے تھے کہ تصوف وعرفان اور علوم وفنون کے تمام گوشوں سے گہری واقفیت ہوگئی تھی حقیقت کو پالینے کی تڑپ نے اس کو ذرہ سے آفتاب بنادیا اور اس نے حکومت وسلطنت کی طرف توجہ صرف کرنے کے بجائے اپنے لئے تصوف وعرفان کو نجات کا راستہ تصور کیا

''ان عقیدت کیشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہزادہ ملکی انتظامات سے کنارہ کش ہو کر ارباب تصوف کی خدمت کو اپنے لئے سرمایہ دینوی اور اخروی سمجھنے لگا چونکہ شاہ جہاں نے اس کی تعلیم پر پوری توجہ صرف کی تھی اور اس کا علمی مرتبہ خاصہ بلند تھا اس لئے اس کے قلم نے اپنی جولانیوں کے لئے تصوف کا میدان پسند کیا''۔ ۲

داراشکوہ کو اپنے آباؤ اجداد ہی کی طرح شعر وشاعری سے بڑی گہری دلچسپی اور وابستگی تھی وہ نہ صرف یہ کہ وہ شاعروں پر دل کھول کر انعام واکرام کی بارش کرتا تھا بلکہ خود بھی بہترین شعر کہتا تھا اور قادری تخلص کرتا تھا فارسی ادب میں اس کا مختصر دیوان خاص اہمیت ومرتبہ کا حامل ہے اس کا تمام فارسی کلام صوفیانہ رنگ اور عارفانہ نکات کا ترجمان ہے اس کی فارسی شاعری کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ دارا کے زبان وبیان میں شیرنی زبان، لطافت بیان اور نزاکت الفاظ کا دھیان نہیں رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے معاصرین ومتاخرین شعراء کی صف میں بحیثیت شاعر کے اس شہزادے کو کوئی خاص مقام ومرتبہ حاصل نہیں ہوسکا ہے جیسا کہ جناب احمد نبی خان داراشکوہ کی شاعرانہ خصوصیات پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ اس کی شاعری شاعرانہ جذبات اور لطافت زبان کے اعتبار سے بالکل بے جان ہے یہ ہی وجہ ہے کہ اس کے ہم عصر نیز متاخر شعراء کی صف میں کوئی جگہ نہ مل سکی غیر دلچسپ اسلوب کی وجہ سے داراشکوہ کی شاعری کو قبول عام حاصل نہ ہوسکا''۔ ۳

سید صباح الدین بھی داراشکوہ کی شاعری خاص طور پر اس کی غزلیات کے متعلق کم وبیش اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ اس کے یہاں تغزل وترنم کی کمی کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے اور اس نے ایک محدود دائرے میں خود کو سمیٹ کر اپنے شاعرانہ احساسات وخیالات کا اظہار کیا ہے جس کی وجہ سے ایک شاعر کی حیثیت سے وہ کوئی قابل ذکر شعراء کی صف میں بہت پیچھے نظر آتا ہے لہٰذا وہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان غزلوں میں تغزل بالکل نہیں اس لئے ان میں غزل گوئی کا لطف نہیں ملتا، داراشکوہ کے جو

خاص عقاید تھے انھیں کی ترویج اس نے غزلوں میں کی ہے''۔۴

یہ درست ہے کہ داراشکوہ کے یہاں معاصرین شعراء کی طرح زبان و بیان کی رنگینیاں اور دلفریبیاں نہیں ہیں وقتاً فوقتاً تغزل کی عدم موجودگی کا بھی احساس ہوتا ہے با این ہمہ دارا کی شاعری کی اہمیت، افادیت اور معنویت کو اتنی آسانی کے ساتھ نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا اس نے اپنے اشعار میں جو صوفیانہ اور عارفانہ اسرار و رموز بیان کئے ہیں وہ ہر دور میں ہر مکتبہ فکر کے لئے لائق تفکر اور سزاوار تامل رہے ہیں اور اتنا وقت گذر جانے کے بعد بھی ان میں کسی قسم کی کہنگی یا فرسودگی کا احساس نہیں ہوتا، دارا شکوہ کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ تصوف کے اسرار و رموز اپنے آپ میں بہت پیچیدہ اور مشکل ہوتے ہیں جن کا سمجھنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے اور اگر انداز بیان بھی مشکل اختیار کرلیا جائے تو تصوف کے ان رازہائے سربستہ کو سمجھنا اور بھی زیادہ دشوار ہوجائے گا لہٰذا غور و فکر کے متقاضی متصوفانہ نکات کو عام فہم اور سادہ زبان میں ادا کیا جانا ہی مناسب ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کرسکیں یہ ہی وجہ ہے کہ وہ کہتا ہے:

این مسایل کہ گفت بسی مشکل
قادری ہست در اشعار

یہ ہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے ہمہ متصوفانہ اسرار و رموز کی عکاسی اتنے ماہرانہ اور فنکارانہ انداز میں کی ہے جس کی نظیر اس کے معاصرین صوفی شعراء کے یہاں تو کم از کم دیکھنے کو نہیں ملتی ہے، اس کا رنگ روائتی صوفی شعراء سے بالکل مختلف ہے اس کے معاصرین صوفی شاعروں کے یہاں لفظ پرستی کو شاعری کی معراج قرار دیا گیا تھا یہ ہی وجہ ہے کہ اس دور کی صوفیانہ اور عارفانہ فکر اسی لفظ پرستی کے قفس میں طائر پر بستہ نظر آتی ہے لیکن اپنے دور کی شاعرانہ روایات کے برعکس دارا شکوہ زبان و بیان کی آرائش و زیبائش کے بجائے معانی کی تہہ داریوں کو مقصد شعری قرار دیتا ہے مفتی غلام سرور نے دارا کے کلام کے متعلق نہایت عادلانہ رائے پیش کرتے ہوئے بالکل درست کہا ہے وہ رقم طراز ہیں:

''سخنش دریائی توحیداست کہ اززبان گوہر افشاوروان گشتہ وباخورشید وحدانیت است کہ از افق لبان مطلع انوارش طلوع شدہ مغزی باید کہ سخنش را بہ فہمد ولی باید کہ معانی آن در دلی امکان پذیرد''۔۵

داراشکوہ کی ہمہ فارسی شاعری اور اس کی تمام علمی خدمات ہماری وہ قیمتی میراث ہیں جس میں ذرہ کو آفتاب بنادینے، مردہ دلوں میں اس سرنو زندگی پھونکنے اور قلوب پریشان کو دایمی خوشی و راحت پہونچانے کے تمام لوازمات موجود ہیں دورہ حاضر میں ہم جس اخلاقی بحران، ذہنی انتشار، سیاسی تنزلی، معاشی بدحالی اور مذہبی خلفشار کا شکار ہیں ان حالات

نے ہماری آنکھوں کے سامنے نے جو تاریکی اور مایوسی کی ایک دبیز چادرڈال رکھی ہے اس سے باہر نکل کرایک باوقر، باعزت اور سربلند زندگی جینے کے لئے اس شہزادے کے کلام میں موجود اخلاقی نکات پر اور صوفیانہ تعلیمات پر عمل کرنا نہایت ضروری ہے تا کہ ایک بہترین اور خوشحال معاشرے کا قیام عمل میں آسکے اور تمام لوگ آسودہ حال، بے خوف اور مطمئن ہوکر اپنی اپنی زندگی گزار سکیں جیسا کہ ایک پرسکون اور آسودہ زندگی گزارنے کے متعلق وہ خود بھی کہتا ہے کہ ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کرو معرفت کو پہچانو اور جب راضی برضا ہو جاؤ تو پھر تم پر کچھ بھی گزرے اس کی شکایت زبان پر لانے کے بجائے اس کو خندہ پیشانی سے قبول کرلو تا کہ دل کی دولت تم کو ہمہ چیز ہائے فانی سے بے نیاز کردے اور حقیقی دولت سے تمھارا دل مالا مال رہے۔

خوش دار ہمیشہ ای برادر جان را
در خانہ معرفت نشان مہمان را
اندر رہ عشق ہر پیشت آید
بر دیدہ وسر قبول می کن آن را

جدید سائنس اور ٹکنالوجی نے انسانی وجود کو کتنا ہی راسکون وراحت بہم پہونچانے کا کارنامہ انجام دیا ہو لیکن حقیقت یہ ہی ہے کہ تمام تر جدید لوازمات کے باوجود ان میں قلبی شادمانی، روحانی آسودگی اور ذہنی سکون کو کوئی بھی سامان نظر نہیں آتا ہر قدم پر مشینوں کا سہارا لینے والا، جدیدیت کی دہائی دینے والا اور خود کو سب سے طاقت ور سمجھنے والا آج کا مغرور و متکبر انسان کس قدر مجبور اور بے بس ہے اس کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے یہ ہی وہ مجبوری اور لاچاری ہے جو دور حاضر کے جدید تعلیم سے آراستہ و پیراستہ انسان کو بھی روحانیت و تصوف کی طرف مایل و متوجہ ہونے پر مجبور کردیتی ہے کیونکہ اس کو اپنے ذہنی انتشار اور قلبی بے سکونی کو فرو کرنے کے لئے سوائے تصوف کے دامن میں پناہ لینے کے کوئی اور دوسرا راستہ نظر نہیں آتا یہ ہی وجہ ہے کہ مادیت کو چھوڑ کر انسان روحانیت کی طرف قدم بڑھاتا ہے تا کہ اس کی روح کو مسرت وشادمانی حاصل ہو سکے دارا کی شاعری سے بھی ہم کو مادیت (جس کی وجہ سے پوری دنیا انتشار اور بدامنی کا شکار ہے) سے بے نیازی اور روحانیت کی طرف راغب ہونے کا حوصلہ ملتا ہے وہ کہتا ہے کہ اس دنیاوی دولت کی جمع آوری کی وجہ سے خاطر جمعیت پر زوال آجاتا ہے جو انسان کا بہت بڑا خسارہ ہے لہٰذا بہتر یہ ہی ہے کہ اس بارگراں یعنی حب دنیا اور عیش جسمانی سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کرلی جائے کیونکہ یہ دنیاوی چیزیں اور ان کی طلب انسان کو اس کے محبوب حقیقی سے دور کردیتی ہے اور اس دوری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ سرگرداں و مشوش اور پریشان و حیران رہتا ہے اسی لئے بہتر یہ ہی ہے کہ دنیاوی تمام خواہشات کو اپنے دل کے قبرستان میں دفن کردیا جائے کیونکہ ان دنیاوی حسرتوں کو بار اپنے سر

پر اٹھا کر چلنے سے کوئی فائدہ نہیں اس سے سفر کی تکالیف میں اضافہ ہوتا ہے جو سوائے نقصان کے کچھ اور نہیں ہے اس سلسلے میں داراشکوہ کچھ اس طرح گویا ہوتا ہے:

ہر چند کہ بی خواہش زر باشد
جمیعت خاطر تو کم تر باشد
این بار گران چرا بر سر داری
ندر سر کس موافق سر باشد

داراشکوہ کی متصوفانہ شاعری کا ایک سرسری مطالعہ کرنے سے ہی سب سے پہلی حقیقت یہ منکشف ہو کر سامنے آتی ہے کہ اس نے نظریہ ''وحدت الوجود'' کو اپنایا اس نظریہ کو ماننے والے صوفی حضرات کے مطابق خالق و مخلوق میں کسی قسم کی دوئی نہیں ہے وہ ایک ہی ہیں جو الگ الگ نظر تو آتے ہیں مگر الگ ہیں نہیں، داراشکوہ بھی اسی نظریہ کا حامی ہے اس کا کہنا ہے کہ اس کائنات میں موجود تمام چیزوں کی اصل ایک ہی ہے یہ ہی وجہ ہے کہ کسی بھی دانشور کو ذات واحد میں دوئی کا خیال نہیں آیا صرف ایک ہی وحدت ہے جس نے کثرت کی شکل اختیار کر لی ہے لیکن یہ کثرت صرف ایک وہم سے زیادہ کوئی اہمیت یا حیثیت نہیں رکھتی ہے یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں کہ اس کائنات میں بہت سی چیزیں موجود ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی دوسری چیز کا وجود اس طرح ہے جیسے کوئی روشنی ہوتی ہے جو دکھائی تو دیتی ہے لیکن حقیقتاً اس کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے لہٰذا وہ اپنے اس پیغام کو شاعرانہ انداز میں کچھ یوں ادا کرتا ہے:

در ذات دوئی ، ندید ہوشیار
ما و تو بود، برای گفتار
اعداد میان یك، عیان بین
از یك بنگر کہ گشت بسیار

داراشکوہ نے جس نظریہ ''وحدت الوجود'' کی تشہیر و اشاعت پر زور دیا اس کے لئے مسلمان ہونا کوئی لازمی شرط نہیں ہے یہ وہ نظریہ ہے جو ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری اقوام میں مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے جس طرح دریا میں موجود قطرات، لہریں اور بھنور وغیرہ مختلف نام تو ہیں لیکن اصل حقیقت یا صداقت ان ناموں کی نہیں بلکہ اس دریا کی ہے ٹھیک اسی طرح مخلوق خداوندی کے الگ الگ نام تو یقیناً ہیں لیکن حقیقتاً وہ سب ایک ہی وحدت کا جز یا حصہ ہیں نام مختلف ہونے سے حقیقت نہیں بدل سکتی ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ اس حقیقت کو سمجھا جائے اور دوئی کے اس مکر جال سے خود کو آزاد کیا جائے یہ ہی سبب ہے کہ داراشکوہ اس حقیقت کو شعر کی زبان میں کچھ اس طرح ادا کرتا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ

سکتا:

يك ذره نديدم ز خورشيد سوا
هر قطره آب هست عين دريا
حق را بچه نام كس تواند خواند
هر اسم كه هست، هست ز اسما خدا

داراشکوہ اسی وحدت کی تبلیغ واشاعت میں منہمک ومستغرق رہتا ہے جواس پوری کائنات میں جلوہ گر ہے لیکن ہم اپنی حرص وہوس کی وجہ سے اس کے دیدار سے محروم رہتے ہیں اور ہماری تلاش حق بے سود ہو جاتی ہے کیونکہ ہم دوئی کا پردہ اپنے دل سے اٹھا پانے میں کامیاب نہیں ہو پاتے دارا بار بار وحدالوجود کے متعلق اپنے احسات درون کی پردہ کشائی کرتا ہے اوراس میں اورزیادہ شدت آتی چلی جاتی ہے ملاحظہ کیجئے اس کے چنداوراشعار جواس کے نظریہ ''وحدت الوجود '' کی بھر پور نمایندگی کرتے نظر آتے ہیں:

همه موجود در وجود ما
گنج مخفی است این نمود ما
گرچه در پرده داشتیم آواز
شدنی ظاهر این سرود ما
ما ندیدیم ،هیچ غیر نمود
غیر نه نمود در شهود ما
وهم فانی شود نه ما فانی
هست باقی همیشه نمود ما

داراشکوہ کے نزدیک اس کائنات میں نظر آنے والا تمام انتشاراور بےسکونی من وتو کی تفریق کی وجہ سے ہی ہے جو انسان کو کسی بھی صورت چین وسکون کی سانس نہیں لینے دیتی ورنہ تو صداقت اور حقیقت یہ ہے مکان ولامکان،محسوسات ونامحسوسات،موجودات ونا موجودات میں صرف اورصرف اسی ذات واحد کی تجلیاں رونما ہوتیں ہیں داراشکوہ ان سالکین کوبھی مخاطب کرتا ہے جواس خالق کائنات کی تلاش وجستجو میں حیران وپریشان اورسرگرداں گھومتے نظر آتے ہیں اور بے مقصداپنے وقت کوضائع کرتے ہیں،مگرافسوس کہ وہ اس حقیقت سے آگاہی نہیں رکھتے کہ وہ خدا سے جدایعنی اس سے الگ ہرگز بھی نہیں ہیں ان سالکین حق کی تلاش وجستجو اس قطرہ کی تلاش وکوشش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جو

دریا میں رہ کر بھی دریا ہی کو ڈھونڈ نے کی بے وقوفی کر رہا ہے وہ اپنے ان خیالات کی ترجمانی بڑے ہی موثر اور دلنشین انداز میں کرتے ہوئے کہتا ہے:

ای آنکہ خدائی را بجوئی ہمہ جا
تو عین خدائی ،نہ جدائی ز خدا
ای جستن تو بان ہمی می ماند
قطرہ میان آب جوید دریا

اپنے اسی خیال کو ایک اور جگہ اور بھی زیادہ خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ دریا کا ہر قطرہ اپنے آپ میں دریا ہے لیکن جب وہ خود کو اس دریا سے الگ کر لیتا ہے تو اس کی اہمیت وحیثیت ختم ہو جاتی ہے لیکن اگر وہ خود کو اس دریا میں سموئے رکھتا ہے تو اس کی اہمیت اور بقا ہمیشہ قائم ودائم رہتی ہے بس ضرورت خود کو پہچاننے اور جاننے کی ہے یعنی جس نے خود کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو جان لیا لہٰذا انسان کو چاہئے کہ اس ذات واحد کے بحر بیکراں میں خود کو محو ومستغرق رکھے۔

قطرہ را شناسی تو سوا از دریا
ہر چند برون بود ہوا از دریا
ہر قطرہ کہ خویش را بدریا پیوست
دیگر نتوان ساخت جدا از دریا

اس تیموری شہزادے کے کلام میں اخلاقی تعلیمات اور روحانی تربیت کا جو بیش بہا خزانہ موجود ہے وہ یقیناً ہم سب لوگوں کے لئے قابل فکر اور لائق تامل ہے وہ اپنے کلام میں دروغ گوئی ریاکاری، ظاہر پرستی، خودسری، چاپلوسی اور تملق وغیرہ جیسی اخلاقی برائیوں کی پرزور مذمت اور اخلاص، ایثار، صبر، قناعت، احسان اور خدمت بشر کی تاکید کرتا نظر آتا ہے اس کی اخلاقی شاعری روائتی شعراء کے برخلاف ایک ہمدرد ومخلص دوست کی طرح مشورے دیتا ہے جو اپنے عزیز دوست کی دلسازی اور محبت سے عبارت ہے ذیل میں کچھ اشعار دیئے جا رہے ہیں جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اخلاقی تعلیمات اور عارفانہ خیالات کو شیرینی میں لپیٹ کر پیش کرتا ہے جس سے کہ سننے والے کی طبیعت پر بار نہ ہو اور وہ آسانی سے اس پر عمل پیرا ہونے کی ہمت خود میں پیدا کر سکے وہ کہتا ہے کہ انسان کی یہ زندگی ایک پندار کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے جو اس کو اس کے انجام سے غافل اور بے پرواہ رکھتی ہے لیکن غیر از خدا کسی سے دل لگانا بیکار و بے فائدہ ہے لہٰذا انسان کو بیدار ہو جانا چاہئے تا کہ اس کو اس دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل ہو سکے۔

ای کہ ہستی بخواب شو بیدار
وہم اغیار را ز دل بردار
در جہان ہیچ چیز بد نہ بود
بد اگر ہست، ہست این پندار
مستی وہستی تو غافل کرد
دور کن مستی وبشو ہوشیار
خواب غفلت بزرگ دشمن تست
آب وحدت بپاش وبشو بیدار

داراشکوہ اپنے محبوب حقیقی کی رضاوخوشنودی کے لئے تمام دنیااوراس کے تمام لوازمات سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے ایسے مفاد پرست اور خودغرض لوگوں کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت گوارانہیں کرتا جو خالق کائنات کی نافرمانی کرتے ہیں اور ذاتی مفاداور جسمانی لذت کے لئے بڑے بڑے گناہ کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے دارا خلوص نیت،صفائی قلب اور دیانت داری کے ساتھ اپنے معشوق حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے اور کہتا ہے دنیا کو حاصل کر لینے کے لئے پریشان اور حیران لوگوں کو پیغام دیتے ہوئے کہتا ہے کہ غیرضروری تدبیریں کرنے سے سوائے تکالیف اور الجھنوں کے کچھ حاصل نہیں ہوتا کیونکہ وہ ہی ہوتا ہے جو تقدیر میں ہوتا ہے اور یہ ہی وہ عالی فکر ہے جو گداؤوں اور بوریہ نشینوں کو بھی شان خسروی عطا کرتی ہے دورِ حاضر کا انسان اگر دارا کی اس فکر پرعمل کرے تو یقیناً وہ بہت سے دنیاوی آلائشوں سے خود کو محفوظ رکھ سکتا ہے:

دل شدہ فارغ از ہمہ تدبیر
می شود آنچہ ہست در تقدیر

دنیا کی ناپائیداری اور بےثباتی صوفی شعراء کا پسندیدہ اور محبوب موضوع رہا ہے خیام کی رباعیات ہوں یا ابن یمین کے قطعات، حافظ کی غزلیں ہوں یا پھر سعدی، رومی یا جامی کی مثنویاں سبھی نے اس موضوع کو اپنے اپنے انداز سے بیان کیا ہے داراشکوہ کے یہاں بھی دنیا کی بےوفائی اور ناپائیداری کے سلسلے میں متعدد اشعار ملتے ہیں اس کو اس حقیقت کا بڑی شدت کے ساتھ احساس ہے کہ یہ دنیا فانی اور گذرندہ ہے اور اس سے دل لگانا بیسود وبے فائدہ ہے لہٰذا انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ دنیاوی شان وشوکت، حکومت وسلطنت اور جاہ ومنصب کے لئے اپنی عمر عزیز کو ضائع نہ کرے بلکہ انسان کو اس جہان ناپائیدار میں خود کو ایک مسافر سمجھنا چاہئے اور جس مسافر کے پاس جتنا کم سامان سفر ہوتا ہے اس کا سفر اتنا

ہی آرام دہ اور پرسکون ہوتا ہے یہ ہی وجہ ہے کہ وہ اہل جہان کو اسی بات کا سبق دیتے ہوئے کہتا ہے:

مسافر ہر قدر باشد سبک سار
نیاید در سفر تصدیع وآزار
تو ہم اندر جہان ہستی مسافر
یقین می دان اگر ہستی تو ہوشیار

داراشکوہ لبرل اور سیکولر روایات کا علم بردار تھا اور علمی سطح پر اس نے ان روایات کی اشاعت وتبلیغ میں کسی قسم کا کوئی دقیقہ فروگذاشت بھی نہیں کیا وہ ایک مسلمان صوفی اور ہندو جوگی کی حیثیت سے مشترکہ تمدن اور گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھتے ہوئے دیکھنے کا متمنی تھا لہٰذا وہ اپنے اشعار میں جابجا باہمی اتفاق واتحاد، آپسی رواداری وغیر جانبداری اور محبت اخوت کا درس دیتا نظر آتا ہے اس نے ہندوستان میں رہنے والی ہندو اور مسلمان قوم کے درمیان ہم آہنگی ویگانگت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیر وحرم کی تفریق کو ختم کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے علمائے دین اس پر سخت برہم ہو گئے اور اس پر کافر، زندیق، مرتد اور بدعقیدہ ہونے کا الزام بھی عائد کیا گیا لیکن اس نے کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے صلح کل اور اتحاد کی روش کو تمام مذہبی تعصّبات وتنفرات سے اوپر اٹھ کر نافذ کرنے کی کوشش کی اور انسانی مسایل کو حل کرنے کی طرف متوجہ وراغب رہا تا کہ ہندوستان ملک سکون وامن کا گہوارہ بنا رہے جہاں مصلحت نہیں محبت اور خلوص سے کام کا کی جائے یہ ہی وجہ ہے کہ وہ معترضین کو صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتا ہے:

عشق با مصلحت ندارد کار
مصلحت را بہ زاہداں بگزار

اسی طرح وہ اپنی صلح کل کی پالیسی کے متعلق بھی یہ ہی پیغام دیتا ہے کہ اس ملک میں رہنے والے تمام لوگ امن وسکون، راحت آرام اور مل جل کر اپنی زندگی گزاریں مذہب کی بنیاد پر زندگی جینے کے حسن کو ضائع نہ کریں چنانچہ کہتا ہے

قادری دید تا ترا در کل
صلح کل کردہ، از عناد گذشت

داراشکوہ کی جانب سے دکھایا گیا یہ صلح کل ورواداری اور امن وآشتی کا یہ پرسکون اور پیارا راستہ آج کے جمہوری حکمرانوں اور خود ہم سب ہندوستانیوں کے لئے بھی فلاح وبھلائی کا راستہ ثابت ہوسکتا ہے بشرطیکہ اس پر پورے خلوص، ایمانداری اور بے غرضی کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جائے تو اس راستے پر چل کر بہت سی سماج میں تیزی سے پنپ رہی برائیوں کو فرو کیا جاسکتا ہے اور اپنے اس ملک کو امن وسکون کا گہوارہ بنایا جاسکتا ہے۔

داراشکوہ نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے متعدد تصورات اور عقاید کو یکجا کرتے ہوئے قومی یکجہتی اور آپسی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی اس نے ایک خالق کائنات کی محبت اور اس پورے عالم کو آئینہ خانہ حسن وحدت بنانے پر زور دیا جس میں آپسی نفرت، حسد، خودغرضی، تعصب، تنگ نظری اور انا پرستی کی کوئی گنجائش نہ ہو جہاں ہر شخص قابل محبت اور ہر زندگی لائق احترام ہو اس نے ان تمام تصورات کو سختی سے رد کیا جس میں ایک مذہب کو دوسرے مذہب، اور ایک انسان کو دوسرے انسان سے نفرت کرنے پر اکسایا جاتا ہو یہ اس کے گہرے، حقیقی اور عملی فلسفہ کی آفاقیت وابدیت ہی ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس کے خیالات وافکار اہل خرد کی توجہ کا ومرکز بنے ہوئے ہیں حالانکہ ان خیالات کی پاداش میں اس کو بہت بڑی قیمت چکانی پڑی لیکن اس نے وقت وحالات کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا اگر اس کے احساسات وتصورات کو اس کے عہد میں پذیرائی حاصل ہوئی ہوتی تو یقیناً ہندوستان کی سیاسی وسماجی زندگی کا نقشہ دوسرا ہوتا لیکن افسوس کہ یہ عظیم شہزادہ بہت کم عمر ہی میں اپنے افکار وعقائد کی تشہیر کر موت کی گمنام گلیوں میں ہمیشہ کے لئے فنا ہو گیا جیسا کہ ایک پاکستانی مورخ کے حوالے سے پروفیسر سید محمد عزیز رقمطراز ہیں:

> ''داراشکوہ کی تصنیفات میں تلاش وجستجو کے باوجود بھی کوئی ایسا اندراج نہیں نظر آتا جس سے اس کا الحاد ثابت ہو سکے بہر حال داراشکوہ کو ۱۶۵۹ء میں دہلی کے ایک گاؤں خضر آباد میں قتل کر دیا گیا اس طرح ہندوستان دارا جیسے عالم حکمران جو قومی یکجہتی، انسانیت اور بھائی چارے جیسے خیالات کے حامی سے محروم ہو گیا''۔[۶]

یقیناً دارا تصوف وعرفان کے اس اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں تمام امتیازات واعتراضات وتعصّبات مٹ جاتے ہیں اور کائنات کی ہر شے میں ایک ہی ذات کا جلوہ نظر آتا ہے اور انسان تمام چیزوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے تصوف وعرفان کی اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے داراشکوہ کے بارے میں جناب وارث کرمانی رقمطراز ہیں:

> ''وہ فکر وسلوک کی اس منزل میں تھا جہاں ناقص وکامل اور ادنیٰ واعلیٰ کو ایک ہی نظر سے دیکھا جاتا ہے یہ ایک مقام ہے جو فقراء کے علاوہ ارباب شریعت کے حصے میں نہیں آتا اور وہ اس لئے کہ موخر الذکر طبقہ کے فرائض میں باطن کی اصلاح داخل نہیں ہے ان کا فتویٰ ظاہر پر چلتا ہے فقراء کی نظر ظاہر وباطن کی ترازو ہوتی ہے اور قدرت ان کو اتنا عالی ظرف عطا کرتی ہے کہ وہ مسلم اور کافر دونوں کو نگاہ لطف وکرم سے نوازتے ہیں''۔[۷]

داراشکوہ نے اپنی شاعری کے ذریعے اصلاح فکر اور پاکیزگی نفس کے سلسلے میں جو کچھ بھی پیش کیا وہ ہمارے لئے باعث فکر اور لائق تقلید ہے تصوف کی کے اس راہ راست پر جیسے جیسے آگے کی جانب بڑھتا چلا گیا اس کی تعلیمات میں

اور زیادہ جاذبیت آفاقیت پیدا ہوتی چلی گئی اس نے تمام تعصّبات وتکلفات سے قطع نظر کرتے ہوئے انسان کا بحیثیت انسان کے مطالعہ کیا اور بہ بانگ دہل یہ اعلان کرنے میں کسی تردد کا مظاہرہ نہیں کیا:

نبود بہ جہان نکو تر از مشرب ہیچ
باید کہ ترا بود جز او مطلب ہیچ
توحید گزین وصلح کل پیش بگیر
بگزار تعصب کہ بود مذہب ہیچ

مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ داراشکوہ کے تقریباً ہمہ عارفانہ احساسات وخیالات، متصوفانہ نظریات وعقاید ایک ایسی روحانی قوت کا نام ہیں جو باد مخالف کی تماتر تیزی وتندی کے باوجود ایک ٹھنڈے میٹھے بہتے ہوئے جھرنے کے پانی کی طرح اپنے پڑھنے والوں کے اذہان وقلوب کو شادمانی وآسودگی بخش رہے ہیں اس کے کلام کی معنویت ولطافت اس تاریکی بھرے ماحول میں ایک صحت مند، باوقار، باعمل اور پاکیزہ زندگی گزارنے کی ترغیب وتشویق پیدا کرتی ہے اس کا ہمہ منظوم کلام محبت وصلح کا پیامبر، سکون وامنیت کا مظہر اور مسرت وشادمانی کا ضامن ہے اس بحرانی صورت حال میں جبکہ اخلاقی اقدار اور غیر اخلاقی تعصّبات کا تصادم اپنے عروج پر ہے، داراشکوہ کی اخلاقی تعلیمات اور متصوفانہ رجحانات پر کام کرنا اور انکو عام کرنا ہمارا اجتماعی فریضہ ہے اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم نہ صرف اس بیش قیمت اور گرانقدر سرمایہ کی بازیافت کی طرف متوجہ ہوں بلکہ ان روحانی تعلیمات کے ذریعے دیگر اقوام کے اذہان وقلوب کو بھی منقلب کرنے کی کوشش کریں تاکہ اس دور میں تیزی سے پھیل رہی ہیں سماجی برائیوں کو فرو کرنے میں مدد مل سکے۔

ماخذ ومنابع:

۱۔سفینۃ الاولیاء، داراشکوہ، مترجم وارث کرمانی، اردو پریس میکلوڈ روڈ لاہور، صفحہ نمبر ۱۷۔

۲۔انوار تصوف، ڈاکٹر سیدہ عصمت جہاں، شارب کمپیوٹرس حیدرآباد، صفحہ نمبر ۸۴۔

۳۔دیوان داراشکوہ، داراشکوہ تصحیح احمد نبی خان، دین محمد پریس لاہور ۱۹۶۹، صفحہ نمبر ک۔

۴۔بزم تیموریہ جلد سوم، سید صباح الدین، معارف پریس شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۰۹، صفحہ نمبر ۱۹۴۔

۵۔خزینۃ الاصفیاء جلد اول، مفتی غلام سرور لاہوری، ثمر ہند پریس لکھنؤ ۱۲۹۰ھ، صفحہ نمبر ۱۷۵۔

۶۔تاریخ عہد وسطیٰ، سید محمد عزیز الدین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۲۰۰۴ء، ۱۶۳۔

۷۔۔سفینۃ الاولیاء، داراشکوہ، مترجم وارث کرمانی، اردو پریس میکلوڈ روڈ لاہور، صفحہ نمبر ۱۷۔

☆☆☆

سید مزمل مرتضیٰ
شعبہ فارسی
کشمیر یونیورسٹی، کشمیر

غالب کی ایک فارسی غزل۔۔۔ایک تجزیہ

غالب کی یہ غزل جس کا مطلع یوں ہے "زمن گرت نہ بود باورِ انتظار بیا" ان کے تخلیقی فن کی آئینہ دار ہے۔اس غزل میں غالب کی نفسیاتی کیفیت اور زہنی اُپج تخلیقی سطح پر زیریں لہر کے بطور کام کر رہی ہے۔ یہ غزل بشمول مقطع کے گیارہ اشعار پر مشتمل ہے۔جس کے قافیے صوتی آہنگ کے لحاظ سے ردیف بیا (آجا) کے ساتھ مکمل ہم آہنگی کے ساتھ فن کار نے استعمال کیے ہیں۔جس سے غزل کا مجموعی تاثر کافی حد تک بڑھا ہوا ہے۔ یہ غزل عشقیہ رنگ میں رنگی ہوئی ہے اگر چہ اس کے اشعار بلحاظ مضامین جداگانہ ہیں لیکن ان میں در پردہ معنوی ربط پایا جاتا ہے۔جس سے غزل کے اشعار میں تسلسل پیدا ہو گیا ہے۔

زمن گرت نہ بود باورانتظار بیا
بہانہ جوئی مباش ستیزہ کار بیا

مذکورہ غزل میں بیا ردیف سے ہی اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ شاعر محبوب کو آخری مرحلے کی دعوت دے رہا ہے ۔مطلع میں مستعمل لفظوں جیسے 'ستیزہ کار' اور 'نہ بود باورانتظار' سے مترشح ہوتا ہے کہ عاشق نے محبوب کو اس سے پہلے بھی اپنے پاس آنے کی دعوت دی تھی جس کا یقین محبوب کا عاشق کو نہیں آیا ہے۔لیکن اب جو دعوت دی جا رہی ہے وہ حتمی ہے اس میں محبوب سے گزارش کی جا رہی ہے کہ اب بہانے مت تراش لڑنے جھگڑنے کے لیے ہی آجاو۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس سے پہلے محبوب شاید اسی لیے بہانے تراشتا تھا کہ عاشق اُس کی ستیزہ کار طبیعت کی تندی برداشت نہ کر سکے یا عاشق کے عشق کا امتحان لینا مقصود ہو۔لیکن شاعر نے دوسرے مصرعے کے دوسرے نصف میں معشوق کی اس احتیاط ورزی کو بھانپ کر خود یہی سے اس احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر اس کے ذکر کے ساتھ محبوب کو دعوت دی ہے۔ یہاں غالب کا یہ اردو شعر ذہن کے پردوں پر رقص کرتا ہے۔

آج وہاں تیغ و کفن باندھ کر جاتا ہوں میں ۔عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا۔1

پوری غزل میں ایسا لگتا ہے کہ شاعر اپنے آپ کو شہید وفا ہونے کے لیے مکمل طور آمادہ کر چکا ہے۔اور عاشقی میں

معشوق کے ہاتھوں جان دینے کی ٹھان لی ہے۔جیسا کہ پہلے شعر میں ستیزہ کار بیا(یعنی لڑنے کے لیے ہی آجا) جیسے لفظوں سے صاف واضح ہوجاتا ہے۔غالب کی زندگی غم واندوہ سے پُرتھی اوران کا غم نہایت ہی سلجھا ہوا تھا۔جس شاعر کی نفسیاتی کیفیت ان اشعار سے واشگاف ہوتی ہو۔

رنج اٹھانے سے بھی خوشی ہوگی پہلے دل دردآشنا کیجئے

یا یہ شعر ان آبلوں سے پاوں کے گھبرا گیا تھا میں جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر 2

اس شاعر سے یہ بعید نہیں کہ وہ دوسرے شعر میں یہ کہہ رہا ہو۔

بیك دو شیوہ ستم دل نمی شود خرسند
بہ مرگ من کہ بہ سامان روزگار بیا

دوایک طریقوں سے ستم کرنے سے میرا جی نہیں بھرتا۔میری موت کی قسم آجکل کے نئے ستم لے کرآجا۔اس شعر میں بہ مرگ من دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ایک یہ کہ یہ جزقسمیہ ہے۔معشوق سے کہا جائے کہ مثلاً میں مروں یاتم میرا مرا ہوا منہ دیکھو اگرتم نے یوں نہ کیا۔دوسرے یہ کہ میرے فنا کرنے یا مارنے کے لئے نئے اوررائج ستم لے کرآجاو ۔لفظ 'بہ' قسمیہ بھی ہے اور فارسی میں یہ لفظ بطور' کے لئے' بھی استعمال ہوتا ہے۔پہلے دوشعروں میں شاعر عاشق کی اذیّت پزیر شخصیت کے جلوے دکھا کر محبوب یا معشوق کو اکسانے کی کوشش کرتا ہے لیکن جلد ہی اس کو احساس ہوتا ہے کہ اس طرح کام چلنے والا نہیں، بلکہ کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔اوراس طرح تیسرے شعر میں عشق کے حسّاس پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے محبوب کی رگِ حمیّت کو جھنجھوڑتا ہے۔اور کہتا ہے۔

بہانہ جوست در الزام مدعی شوقت
یکی بہ رغم دل ناامیدوار بیا

یہاں عشق جنون کی حد تک پہنچتا ہے۔اور شکوک وشبہات کا درآنا برمحل ہے۔شک محبوب پر نہیں بلکہ رقیب پر ہوتا ہے کہ وہ معشوق کو عاشق کے خلاف ورغلاتا ہے اوراس کے آنے میں مانع ہوجاتا ہے۔ایسی صورت میں عاشق معشوق کے مائل بہ آمدن ہونے سے ناامید ہوجاتا ہے اوراس کا عشق اسے یہ کہلاتا ہے کہ ایک بار دل ناامیدوار کی خاطر ہی آجا۔

ہلاك شیوۂ تمکین مخواہ مستاں را
عنان گسستہ تر از باد نوبہار بیا

معشوق کی رگِ شفقت پر ضرب مارنے کے بعد اب عاشق کو لگتا ہے کہ وہ کسی حد تک راہ پرآ ہی جاتا ہے لہذا اسے متنبہ کرتا ہے اوراسے آنے کا انداز بیان کررہا ہے اس شعر میں محبوب کے آنے یا اسے بلانے کی کیفیت ماسبق

شعروں کی بنسبت اور زیادہ تیز تر ہوتی ہے۔ کہتے ہیں مستوں کو فرمانبردار چاہ لیکن اپنے ناز وغرور میں تغافل برتنے پر صبر کرتے کرتے، ضبط کرتے کرتے وہ مرجائیں، یوں اپنے عاشقوں کو ہلاک ہوتے نہ چاہو۔ یہاں مستاں لفظ میں صیغۂ جمع استعمال کر کے شاعر دراصل اپنی طرف اشارہ دیتے ہیں مگر ایک عمومی پیرایۂ اظہار میں۔ معشوق سے کہتا ہے کہ باد نو بہار کی طرح بلاشرط ہر رکاوٹ کو توڑ کر آجا۔ اس شعر میں معشوق کے آنے کے لئے بادِ نو بہار کی تشبیہ کا استعمال بڑا معنی خیز ہے۔ کیونکہ باد نو بہار کے آنے سے گلوں میں رنگ بھی بھر جاتے ہیں اور ہوا میں خوشبو بھی پھیلتی ہے۔ اور غالب کا محبوب کے آنے سے ان دونوں تحولات کے واقع ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ کرنا ابلغ وافصح ہے۔ یہاں غالب نے اپنی ندرت بیان اور جدّت ادا کا ہمیشہ کی طرح ثبوت فراہم کیا ہے۔

زِ ما گسستی و زِ دیگراں گرو بستی
بیا کہ عہدِ وفا نیست استوار بیا

معشوق چونکہ ماضی میں وعدوں کو توڑتا آیا ہے۔ اور اس کو اگر وہی شرم آنے میں دامن گیر ہو اور وہ نہ آسکے۔ اس پہلو کو بھی عاشق مدنظر رکھے ہوئے ہیں اسی لئے محبوب سے کہتے ہیں کہ وعدہ ہمیشہ ٹوٹ ہی جاتا ہے۔ کون سا مضبوط اور استوار ہوتا ہے۔ اگر آپ نے وعدہ توڑا تو کوئی مضائقہ نہیں۔

تیرے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا 3

شعر میں صنعت ردالعجز علی الابتدا مع تکرار کے استعمال نے خوبی پیدا کی ہے۔

وداع و وصل جداگانہ لذّتی دارد
ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

یہ اس غزل کا بیت الغزل شعر ہے۔ اس میں روانی، سادگی اور عامیانہ الفاظ میں گہرائی اور نفسیاتی کیفیت کا شاعر نے بخوبی نقشہ کھینچا ہے۔ کہتا ہے کہ رخصت ہونے اور وصال دونوں کی اپنی اپنی لذّتیں ہیں۔ آپ ہزار بار رخصت ہوجاو اور لاکھ بار آجاو اس طرح آنے جانے کا سلسلہ قائم رہے اور ہماری زندہ رہنے کی کوئی صورت بھی بن جائے۔ یہاں تک غزل آتے آتے عاشق کا مرثیہ بن جاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب اس غزل کا پیرائیہ بیان بدلتا ہے اور شاعر بڑی حسرت سے کہتا ہے۔

تو طفل سادہ دل ہمنشین بد آموز است
جنازہ گر نتواں دید بر مزار بیا

تو سادہ دل بچے کے مثل ہے تجھے حیلے و مکر نہیں آتے ہیں۔ اور تیرا ہمنشین تجھے غلط سبق پڑھا رہا ہے۔ اگر

جنازے پر نہ آ سکے تو مزار پر ہی آ جاو۔اور آ گے کہتے ہیں کہ میں ناز و اندازِ محبوبی سے فریب کھا چکا ہوں ورنہ کیا کیا نہیں چاہتا تھا۔اب صرف اگر یہ آرزو نکلتی کہ وہ جان امیدوار کا حال پوچھنے کے لئے ہی آ جاتے۔ایک سچے عاشق کی طرح شاعر اگلے شعروں میں اپنے ہاتھ پاؤں شل ہونے کی بات کرتا ہے ۔اور آخر پہ اپنے مرجانے کا بھی عندیہ دیتا ہے اور پھر جب اس سب سے ناامید ہے تو آخری دوشعروں میں خود کو ہی تسلّی کے طور پہ کہتا ہے کہ جہاں ہستی ہے وہاں غم ہے ۔بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی "ہستی خواہ وہ اعتباری ہی کیوں نہ ہو بہر حال موجبِ آزار ہے۔اس نظریے کی تائید دوسرے اشعار سے بھی ہوتی ہے۔"4

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔5

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں۔6

اور اس غم کو بھلانے کا ایک ہی واحد راستہ ہے اور وہ ہے ہستی کو بھلانا اور وہ تبھی ممکن ہے جب مستی آ جائے ۔مقطع سے پہلے شعر میں جو قافیہ ہوشیار آیا ہے۔اس کے معنی ہیں جان بوجھ کر مست ہونے کے لئے مئے خانے میں آ جانا ۔تاکہ غم ہستی کا علاج ہو۔اردو شاعری میں غالب نے غم ہستی کو بھلانے کے لئے موت ہی کو ایک واحد علاج بتایا ہے۔لیکن یہاں ہستی کو مستی سے بھلا دینے کا اشارہ کرتے نظر آتے ہیں۔

اور اگر مستی کو قول غالب "بنتی نہیں ہے بات بادہ و ساغر کہے بغیر" کے تناظر میں لیا جائے تو عشق کے اس مجازی رنگ پہ غزل کے آخر میں حقیقت کی وہ قلعی کھل جاتی ہے جو منزل مقصود وجود انسانی ہے کیونکہ مقطع میں غالب نے ایک ترکیب 'حلقۂ رندانِ خاکسار' باندھی ہے ۔ اور رندان خاکسار وہ لااُبال لوگ ہیں جنہیں ہستی کا غم نہیں ہوتا۔جو فنا فی الواجب ہوتے ہیں اور انہیں کے حلقے میں غالب حصار عافیت پاتے ہیں۔اس غزل کی محاکاتی تاویل عاشق کا سراپا التجا اور مدارج عشق میں دعوتِ وصال پر منتج ہوتی ہے۔جو کہ اس قبیل کے دوسرے اشعار کا ارچ ٹائپ ہے۔ایک غزل میں غالب کا یہ دعوتی رنگ بڑے زورشور سے آیا ہے۔

بیا کہ قاعدۂ آسمان بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گران بگردانیم
(آو آسمان کا قاعدہ پلٹا دیں گے۔قضا کو شراب کے پیالے کی گردش سے پلٹا دیں گے)

اس غزل کا مطالعہ کرتے کرتے عشق کی گہرائی و گیرائی، جذبات کا وفور، اور حسن کی بے پروائی کی آنچ محسوس ہوتی ہے اور انسان غالب کے اس شعر کی صداقت پر ایمان لاتا ہے۔اور نقش ہائے رنگ رنگ کا مشاہدہ کرتا ہے۔

فارسی بین تا ببینی نقش ھاے رنگ رنگ

بگذر از مجموعہ اردو کہ بی رنگ من است

منابع وماٰخذ:

1۔دیوان غالب اردو

2۔دیوان غالب اردو

3۔دیوان غالب اردو

4۔شرح دیوان غالب اردو صفحہ ۲۳۲ از یوسف سلیم چشتی

5۔دیوان غالب اردو

6۔دیوان غالب اردو

☆☆☆

جاوید احسن
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو
الہ آباد یونیورسٹی، پریاگ راج، یوپی

شاہ تراب علی قلندر کاکوروی اور ان کی فارسی شاعری

غوث ملت حضرت مولانا شاہ تراب علی قلندر ایک کثیر التصانیف صوفی ہیں۔انھوں نے نظم اور نثر ہر دو اصنافِ ادب میں خاطر خواہ سرمایہ بطور یادگار چھوڑا ہے۔انھوں نے اردو، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں شاعری کی اور ان کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات از خود آشکار ہو جاتی ہے کہ تصوف اور روحانیت ان کا خاص موضوع ہے اور اسی کے گرد اُن کی شاعری طواف کرتی ہے۔اردو میں ان کا ضخیم دیوان موجود ہے جس میں انھوں نے مختلف اصناف پر بہ حسن وخوبی طبع آزمائی کی ہے اور اپنی شاعرانہ صلاحیت کا اظہار کیا ہے۔ ہندی شاعری پر مشتمل اُن کی تصنیف 'امرت رس' ایک قابل قدر کتاب ہے جو ہندوستانی رنگ وآہنگ میں ڈوبی ہوئی ہے اور اس کے اشعار میں موسیقیت اور نغمگی کی جلوہ سامانی پوری آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔اس کی ادبی اور تہذیبی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔اُن کی فارسی شاعری بھی اقدار ومعیار کے اعتبار سے قابل توجہ ہے۔ان کے فارسی دیوان میں غزلوں کے علاوہ رباعی، مثنوی، قصیدہ، ترجیع بند، مخمس، قطعہ تاریخ جیسی اصناف نظم موجود ہیں۔ان تمام نگارشات سے یہ بات یقین کے اُجالے میں آجاتی ہے کہ شاہ تراب علی قلندر کو مختلف اصناف پر قدرت کاملہ حاصل تھی۔وہ اپنے افکار وخیالات کو مختلف شعری پیرائے میں بطریق احسن پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔

شاہ تراب علی قلندر کاکوروی نے ابتدا میں شہیدؔ تخلص اختیار کیا لیکن بہت جلد انھوں نے 'تراب' کو بطور تخلص اپنا لیا۔اُن کے فارسی دیوان میں ابتدا میں اختیار کئے گئے تخلص میں صرف ایک شعر ملتا ہے۔

کشت تغافلت مرا ایں عجب ست ماجرا
ہیچ نشد خبر تراؔب قتل کہ شد شہیدؔ کیست

شاہ تراب علی قلندر کی شاعری جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا، صوفیانہ افکار وخیالات سے مزین ہے، اور اس کا خاص سبب یہ ہے کہ وہ طبعاً اور مسلکاً ایک خالص صوفی تھے اور تصوف ان کا وظیفۂ حیات تھا۔انھوں نے صوفیانہ افکار اس روایت کے تحت کہ 'تصوف برائے شعر گفتن خوب است' اپنی شاعری میں داخل نہیں کئے تھے۔اُن کے اشعار میں صوفیانہ افکار و

خیالات ان کے ذاتی تجربات ومشاہدات کا نتیجہ ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا،انھوں نے فارسی شاعری کی مختلف اصناف میں اپنے شعری جوہر دکھائے ہیں اور ان سب کا احاطہ ایک مضمون میں کرنا کارمشکل ہے،اس لئے دیگر اصناف سے قطع نظر اُن کی غزلیہ شاعری کو پیش نظر رکھ کر اُن کی شاعری سے متعلق چند خیالات کا اظہار کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

تصوف کے تعلق سے عام طور سے یہ خیالات رائج ہیں کہ یہ اسلام سے الگ کوئی چیز ہے، جو درست نہیں ۔تصوف اسلام کے تابع ہے اور اس سے الگ اس کا کوئی وجود نہیں ۔شریعت نے اسے ہی'احسان' کا نام دیا ہے۔بعد کے زمانے میں اسی احسان کو بطور اصلاح تصوف کا نام دیا گیا۔

تصوف میں عرفان ذاتِ الٰہی بھی اہم مرحلہ ہے اور صوفی اس مرحلے سے گزرتا ہے اور شاہ تراب علی قلندر بھی عرفان ذات الٰہی کے مرحلے سے گزرے ہیں اس کے شواہد اُن کے کلام میں ،موجود ہے۔ایک بندے پر اس کے معبود کے لامحدود احسانات ہیں اس لئے اس پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ اپنے معبود حقیقی کی حمد وثنا میں ہمہ وقت مصروف رہے اور اپنی زندگی اس کے حکم کے تابع گزارے اور اس کی یاد کو اپنا وظیفۂ حیات بنائے ۔اس لئے شاہ تراب خدا کی شان میں رطب اللسان ہوتے ہیں تو اُن کی زبان قلم سے اس طرح کے اشعار ادا ہوتے ہیں۔

توئی پرور دگارم یا الٰہی — توقع از تو دارم یا الٰہی
مدد گارم توئی در دین و دنیا — کہ باشد جز تو یارم یا الٰہی
بدہ توفیق خیرم در عبادت — ز عصیان شرم سارم یا الٰہی
اگر من سر بسر غرقِ گناھم — توئی آمرز گارم یا الٰہی
چو غفاری و ستار العیوبی — ز تو امید وارم یا الٰہی
نجاتم دہ بکن از عفو رحمت — ز دوزخ رستگارم یا الٰہی
بفکرِ زلف و عارض رفت افسوس — ھمہ لیل و نہارم یا الٰہی
خوشا وقتی کہ گذر در عبادت — حیاتِ مستعارم یا الٰہی
تمنائی تراب از تو ھمیں ست — بیادت خوش گذارم یا الٰہی

یہ اشعار معبود حقیقی کے تعلق سے اُن کے عقائد ونظریات کی توضیح کرتے ہیں۔وہ ایک موحد صوفی ہیں اور خدا کی وحدت اور اس کی ربوبیت پر انھیں یقین کامل ہے۔

شاہ تراب علی قلندر ایک باعمل صوفی ہیں اس لئے وہ پیغام دیتے ہیں کہ اس دنیا میں آنے والے انسان کے لئے

ضروری ہے کہ وہ نیکی اور بھلائی کو اپنی زندگی کا شعار بنائے۔یہ دنیا عیش گاہ نہیں ہے بلکہ عاقبت کی کھیتی ہے۔عاقبت سنوارنے کے لئے دنیا سنوارنے کی بھی ضرورت ہے اور دنیا سنوارنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار بندہ بن جائے۔اس ضمن میں ان کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

مزرع عقبی ست دنیانی مقر و عیش گاہ
تخم نیکی گشتہ ز ینجا باز مستعجل بر آ

انسان اپنی خواہشات کے پیچھے تازندگی دوڑتا رہتا ہے اور مادی دنیا کی تسخیر میں ہمہ تن مصروف رہتا ہے، حالاں کہ یہ عمل اس کے لئے کارآمد نہیں ہوتا۔اس تن کے لیے تگ ودو کرنا اچھی بات نہیں اس لئے اسے اپنی نفسانی خواہشات کو ترک کر کے عاقبت کی حصولیابی میں لگ جانا چاہئے۔لہٰذا وہ تلقین کرتے ہیں:

بعد مرگ آخر رود ایں قالب خاکی ز تو
قبل مرگ ایجان من از قید آب و گل بر آ

صوفیہ اس بات کی تلقین کرتے رہے ہیں کہ دنیا اور آخرت دونوں کو حسین بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان نفس اور شیطان کے فریب سے اپنے دل کو بچائے اور خُدا اور رسول کے حکم کی پیروی کرے۔شریعت کی راہ میں استقامت کے لیے یہ بھی لازمی ہے کہ وہ کسی مردِ کامل کو اپنا رہنما بنالے، کیوں کہ جس کا کوئی رہنما نہیں ہوتا اس کا رہنما شیطان ہوتا ہے۔مرشد کامل سالک راہِ حقیقت کو شیطان کے مکروفریب سے بچاتا ہے۔اور اسے باطل کی راہ پر گامزن نہیں ہونے دیتا۔یہاں اُن کے چند اشعار پیش کئے جارہے ہیں جن میں اس طرح کے صوفیانہ افکار وخیالات کی واضح عکاسی کی گئی ہے:

باش محکومِ خدا و تابع امرِ رسول
چند باشی زیر حُکمِ نفس و شیطان دل برآ
دست پیری گیر ورنہ رہبرت شیطاں بود
طالبِ حق شو خدا را از رہِ باطل بر آ
مسِ ناقص از طفیل کیمیا زر می شود
اختیار صحبت کامل کن و کامل بر آ
تانمیری در جہان یابی چسان نامِ وصال
نیست شو از ہستی باطل بحق واصل بر آ

پاس انفاس ست راہِ سهل بهرِ یاد حق
ذکر هومی گوی و هر دم هر نفس شاغل بر آ

شاہ تراب علی قلندر کاکوروی کی فارسی غزلوں میں عرفانی رنگ و آہنگ پہلو بدل بدل کر اپنا جلوہ دکھاتے ہیں ۔ان کا محبوب، حقیقی محبوب ہے اور اُن کی غزلوں میں اسی محبوب کا ذکر ملتا ہے۔غزل کی اپنی شعریات ہے اور وہ ہمہ دم یہ اس کی پابند رہتی ہے۔شاہ تراب نے اپنی شاعری میں غزل کی شعریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے افکار و خیالات اور مشاہدات و تجربات کو شاعری کے قالب میں ڈھالا ہے جس کی وجہ سے اس میں غزلیت کا روح کہیں مجروح ہوتی نہیں دکھائی دیتی اور وہ قاری کو بہر طور محظوظ کرتی ہے۔یہاں چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں جو غزل کے حقیقی آہنگ سے مملو ہیں:

خود بخود می کشد نگار مر
نیست در جذب اختیار مرا
ملاحتِ تو بزخمِ دلم نمك ریزد
چه خسته می کنی ای شوخ سبز فام مرا
عرق آلوده رخسارش ببوسه آرزو دارم
بدام خود سانم کاش آن بو با گلابش را

اس طرح کے بے شمار اشعار ان کے فارسی دیوان میں موجود ہیں جن میں محبوب کے حُسن کی جلوں گری موجود ہے۔یہ تمام اشعار عشق حقیقی سے تعلق رکھتے ہیں،لیکن یہ مجاز کے لباس میں ہیں۔حقیقت کی ترجمانی کے لئے مجاز کا سہارا لینا پڑتا ہے کہ لُطافت بے کثافت جلوہ پیدا کرنہیں سکتی،لیکن ان اشعار میں محبوب حقیقی کی ہی عکاسی کی گئی ہے۔چوں کہ تمام حسن کا منبع محبوب حقیقی ہے اور بقول علامہ قتیل دانا پوری:

جمالم بزل حسن بتاں میں کارفرما ہے نگاہیں دیکھتی ہیں ڈوب کے قطرے میں دریا کو

اس لئے اُن غزلوں میں حسن حقیقی کا ہی ذکر حسن مجازی کے پردے میں کیا گیا ہے۔شاہ تراب نے اپنی غزلوں میں عشق کے مختلف مراحل کا ذکر کیا ہے۔ہجر و وصال اور اُن سے پیدا ہونے والی مختلف اللون کیفیات پر مبنی اشعار اُن کے دیوان میں موجود ہیں ۔جن سے عاشقانہ شاعری کی ایک مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے ابھرتی ہے۔لیکن اس عاشقانہ شاعری کو محض عاشقانہ شاعری نہیں بلکہ صوفیانہ شاعری کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔عشق کی مختلف کیفیات کے ترجمان چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بافت از سوزش عشقش سُخنم شور جہاں
کرد دیوانگیش صاحب دیوان مارا
نالۂ دل بر درت بانگ جرس باشد مرا
صحن گلشن بی رخت کنج قفس باشد مرا
ہر چشم سیہ مست تو تایک نظر افتاد
مستانہ دل از ہوش شد و بے جبر افتاد

شاہ تراب علی قلندر کی فارسی غزلوں میں تصوف سے متعلق رنگا رنگ مضامین باندھے گئے ہیں جس کے باعث ان کی شاعری متنوع ہوگئی ہے۔ چوں کہ وہ ایک صوفی منش شاعر ہیں، اس لیے ان کی فارسی غزلوں میں ان مضامین کا بیان شاذ و نادر ہی ملتا ہے جن کا تعلق دنیاوی وارضی معاملات و مسائل سے ہے۔ وہ مسائل تصوف کے ترجمان شاعر ہیں اور یہی ان کی شاعری کا طُرہ امتیاز ہے۔ اس لئے ان کی شاعری کو صوفیانہ افکار کے تناظر میں دیکھا جانا ہی بہتر ہوگا۔

زبان و بیان کے اعتبار سے بھی اُن کی شاعری معیاری ہے اس میں فارسی شاعری کے اس سبک کو اختیار کیا گیا ہے جو روایتی ہے۔ ان کی غزلوں کو پڑھ کر فارسی کے کلاسیکی صوفی شعرا کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ تشبیہات و استعارات کا بھی برمحل استعمال ملتا ہے۔ سلاست و روانی اُن کی فارسی غزل گوئی کی مابہ الامتیاز صفت ہے۔ زیادہ تر مترنم بحروں کا استعمال کیا گیا ہے جس سے کلام کی جاذبیت اور اثر انگیزی میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ معنوی اور صوری ہر اعتبار سے اُن کی فارسی شاعری قابل توجہ ہے۔

☆☆☆

عاطفہ جمال
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

سندیلہ کے چندنامور فارسی شعراء

اتر پردیش کی راجدھانی لکھنؤ سے جانب مغرب ۳۱ میل کے فاصلہ پر ایک بہت ہی قدیم قصبہ آباد ہے جسے سندیلہ کے نام سے شہرت حاصل ہے جس کا ضلع ہردوئی اس سے ۳۴ میل دور مغرب میں واقع ہے اس طرح سندیلہ اولیاء کرام، صوفی، سنتوں، دانشوروں علماء، فضلاء کی بستی لکھنؤ اور ہردوئی کے تقریباً بالکل نصف میں واقع ہے۔ یہ بستی ہمیشہ سے سنتوں اور صوفیوں کی آماجگاہ رہی جس کا ثبوت قدیم مندر اور درگاہیں ہیں قصبہ کی قدامت کا اندازہ اسی بات لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی تاریخ تو دور بلکہ وجہ تسمیہ پر بھی مورخین میں زبردست اختلاف پائے جاتے ہیں۔ مصنف تواریخ سندیلہ کا ماننا ہے کہ ساڈل ارکھ نے اسے آباد کیا جس کی وجہ سے اس کا نام ساڈل پڑا جو بعد میں کثرت استعمال سے سندیلہ ہوگیا۔ آئین اکبری کے مطابق اس کا نام پہلے سینل پور وہ تھا جسے سینل آرکھ نے آباد کیا تھا جو بعد میں بگڑ کر سندیلہ ہوگیا۔ کچھ کا کہنا ہے کہ سہلا وملہا دو بھائیوں نے سندیلہ وملیح آباد کیا۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ مخدوم علاء الدینؒ اپنے پیر ومرشد حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کی عطا کردہ سند لے کر دہلی اس طرف آئے اور راستہ میں اس سند کو دریا برد کر کے کہا کہ میں سنداللہ لے کر جارہا ہوں جس کی وجہ سے پہلے قصبہ کا سنداللہ پھر سندیلہ ہوا۔ بہرحال ان اختلافات سے کم سے کم یہ وضاحت ضرور ہو جاتی ہے کہ قصبہ شروع سے ہی علم وادب کا معروف گہوارہ رہا ہے اور اس گہوارہ کے نامور فرزندوں نے تقریباً ادب کی ہر صنف میں ہر زبان وزمان میں اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ مقالہ کا مقصد اسی قصبہ مردم خیز کے چند نامور فارسی شعراء کا ذکر ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

راجہ درگا پرساد مہر:

راجہ درگا پرساد مہر ولد راجہ دھنپت رائے ۳۱ مارچ ۱۸۴۶ء میں سندیلہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ فارسی زبان وادب میں اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔ خطاب اور کہنہ مشق نثار تھے شاعری کا بھی ذوق تھا اور مہرؔ تخلص کرتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد تعلقدار سندیلہ مقرر ہوئے بعد میں انگریز حکومت نے انہیں ڈپٹی کلکٹر کا بھی عہدہ تجویز کیا لیکن وطن سے محبت اور علمی ذوق وشوق کی وجہ سے مہر نے اس عہدہ کو منظور نہ کیا۔ مہر نہایت مہمان

نواز، خلیق اور ہمدرد انسان تھے اپنی خاندانی عظمت اور رواداری کا بہت خیال رکھتے تھے تصنیف وتالیف کا بہت ذوق تھا آپ کی تصنیفات میں تواریخ سندیلہ، گلستان ہند، بوستان اودھ، تاریخ ایودھیا، حدیقہ عشرت اور مخزن اخلاق بہت مشہور ہیں۔

مہر کو فارسی زبان سے بڑا لگاؤ تھا اور مندرجہ بالا تمام تصانیف فارسی زبان میں ہی ہیں۔شاعری کے سلسلہ میں ان کی ہندوستانی ریاستوں کے عمائدین سے خط وکتابت بھی رہتی تھی اور وہ تمام ان کی شاعری کے معترف اور قدردان تھے، لوگوں کے دلوں میں ان کی یاد کے لئے ان کی ادبی خدمات ہی رہ گئی ہیں جو آج بھی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں اور لوگ استفادہ حاصل کررہے ہیں اور ان کے آثار سے نہ صرف مہر بلکہ قصبہ سندیلہ کا نام بھی روشن ہورہا ہے مہر نے فارسی شاعری میں کوئی دیوان یا کلیات نہ چھوڑی البتہ اپنی نثری تصنیفات میں وہ اشعار کی زبردست پیوندکاری بہ مناسبت موقع و محل ضرور کرتے تھے۔اور وہی اشعار گراں مایہ ذخیرہ کے طور پر ان کی شعری میراث بھی ہیں نمونہ کے طور پر چند اشعار نقل کئے جارہے ہیں:

ای شاہد زیبای سخن جلوہ گری کن
از شوخی خون کان مرا بال وپری کن
ای نام دلکشای تو عنوان کارہا
خال در تو آب رخ اعتبار ہا
سبحان اللہ خدائے بی چون
از چون و چرای عقل بیرون
بیا باغبان خرمنی ساز کن
گل آمد در باغ را باز کن

مولوی باسط علی:

مولوی باسط علی کی ولادت ۱۲۲۹ھ میں ہوئی ان کے والد کا نام مولوی شفاعت علی اور دادا کا نام غلام مرتضیٰ ملک زادہ تھا ان کا اصل وطن کاکوری تھا مگر اپنے والد کا نانیہال ہونے کی وجہ انہوں نے سندیلہ میں سکونت اختیار کی۔آپکی پرورش وپرداخت یہیں سندیلہ میں ہوئی اس زمانہ کے مشہور اساتذہ مولوی فقیہ اللہ اور مولوی یوسف علی کی شاگردی اختیار کی اور ان کا شمار اساتذہ کے ارشد تلامذہ میں ہونے لگا۔مولوی باسط علی حضرت مولانا شاہ تراب علی قلندرؒ تراب کاکوروی سے بیعت تھے۔حضرت مولانا شاہ علی حیدر قلندر ''مشاہیر کاکوری'' میں لکھتے ہیں کہ،

''آپ بہت بزرگ صورت، قابل ولائق ستائش انشا پرداز اور شاعر بے بدل تھے۔''

افسوس کہ ان کے شعر وسخن کا خزانہ ضائع ہوگیا۔ زمانہ حال تک بس ایک غزل کئی واسطوں سے محفوظ ہوکر پہنچی ہے۔ باسط علی نے محافظ دفتری سے تحصیلداری تک ترقی فرما کر وظیفہ حاصل کیا اور اپنے وطن واپس آکر پرانی عزت و عظمت کے ساتھ باقی عمر یاد الٰہی میں گزاری۔ ۸۴ برس کی عمر میں ۱۳۱۳ھ میں انتقال فرمایا اور خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔ آپ کے بڑے صاحبزادے منشی واجد علی تحصیلداری سے ڈپٹی کلکٹری تک ترقی یافتہ تھے اور دوسرے صاحبزادے مولوی مصطفیٰ علی سب رجسٹرار تھے۔ مولوی موصوف کی غزل ملاحظہ ہو:

بیا کی مطرب و مینا بہ طرف بستان است
بخندہ شاھد گل موسم بھاران است
چہ فیضھا کہ بہ عزلت ز لال خضر بتاخت
بھار زندہ دلی مفت گوشہ گیران است
چو مرد بلبل بی دل اسیر کنج قفس
چمن ز لالہ بدل داغ گل پریشان است
بچشم غمزدگان موج گل بود زنجیر
برای غنچہ دلان صحن باغ زندان است
نشستہ ام بحریم فردگان باسطؔ
اسیر کنج قفس بلبل خوش الحان است

حضرت جنید روحانیؒ:

حضرت جنید روحانی ابن جلیل ابن اسماعیل کی تاریخ ولادت باسعادت کا کسی تاریخ یا تذکرہ سے پتا نہیں چلتا البتہ دیگر تذکرہ صوفیاء بیاضوں اور روناموں سے جو معلومات فراہم ہوتی ہیں ان کی بناء پر اتنا کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی ولادت قصبہ موہان میں ہوئی، آپ کو بچپن سے ہی دنیا کی محفل سے کوئی رغبت نہ تھی یاد الٰہی ہی آپ کا مشغلہ تھا لہٰذا سیر و سلوک اور حقیقت و معرفت کی تعلیم کے حصول کے لئے حضرت نظام الدین نارنولی امیٹھوی رحمۃ اللہ علیہ (وفات ۹۰۹ ہجری) کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور معرفت کی راہ میں پیر کے فیض اور محنت ورغبت کی وجہ سے وہ مقام حاصل کیا کہ کشف قبور میں کامل ہوئے۔ تکمیل علم دینی و دنیوی کے استاد نے خرقہ خلافت دے کر سندیلہ میں اقامت اختیار کرنے اور عوام الناس کو فیض پہنچانے کا حکم دیا۔ آپ سندیلہ تشریف لائے اور اس قصبہ اور یہاں کے لوگوں سے کچھ ایسی انسیت

پیدا ہوئی کی اواصل حقیقت یہیں قیام پذیر رہے۔آپ شریعت،طریقت،حقیقت اور معرفت سے خوب واقف تھے اور سندیلہ آکر آپنے اپنے کشف کے ذریعہ لوگوں کو ان بزرگوں کے مزارات کے نشانات سے آگاہ کیا جس لوگ بے خبر تھے۔ حضرت جنید روحانیؒ کے بارے بھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ حضرت سید علاءالدین، میران معزالدین اور مولانا حافظ رحہم اللہ علیہم اجمعین کی ارواح طیبات سے فیضیاب بھی ہوئے (۱)۔صاحب بحر زخار آپ کے استاد، مرتبہ، لقب، معاصر اور کرامات کے بارے میں کہتا ہے کہ:

" آن شمع منور فانوس کمال، آن صاحب دولت دولت بی زوال، آن مخصوص بندگان درگاه ربانی، شیخ المشائخ حضرت شاه جنید روحانی، مرید و خلیفه شیخ نظام نارنولی است۔ قدم مستقیم در عبودت معبود داشت۔ باوجود تعلق علایق عیال قسمی که او در توکل کوشیده سوای شیخ اله دیه خیرآبادی در معاصرانش کم یافته می شود۔ او را لقب روحانی از آنجا است که مرتبۂ کشف قبور و ارواح داشت ۔ سندیله سایر مزار گمنام را او دلیل اسم شد(۲)۔"

صوفیوں کا خاص مشغلہ ہے کہ رات یاد حق میں بسر کرتے ہیں اور دن میں اشیائے زندگی کا سامان مہیا کرنے کی جستجو میں گزارتے ہیں حضرت جنید روحانی کی بھی راتیں یاد خدا میں بسر ہوتیں اور دن کو اطراف کے جنگلوں میں جاتے لکڑیاں لاتے اور انہیں فروخت کر کے حاصل ہونے والے نقد سے اہل خانہ کی ضروریات پوری کرتے اور جو حصہ اضافی ہوتا اسے مساکین میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ایک مرتبہ کسی سوار نے اس بزرگ ہستی سے لکڑیاں چھین لیں اور تازیانے بھی لگائے لیکن انصاف ربانی دیکھئے کہ جب وہ سوار اپنے مسکن کو پہنچا تو اسکے ملازم سے اس تکرار اور ملازم نے سوار کو قتل کر دیا(۳)۔اس واقعہ سے آپ اتنے دل برداشتہ ہوئے اور سوار کی موت کا اتنا رنج ہوا کہ آپ نے جنگل کا رخ کرنا ہی چھوڑ دیا۔اور دن کے بھی اوقات میں یاد خدا میں مشغول ہنے لگے اور اسی روز آپ کے مصارف کے لئے غیب سے ایک تنکہ روزانہ سجادہ کے نیچے مل جایا کرتا تھا۔ایک دن آپ کی حرم محترم نے اس میں سے ایک پیسہ رکھ لیا اور اسی روز سے یہ نعمت غیبی بند ہوگئی۔

" بعد نماز صبح بیرون شهر رفتی، ، هیزم آورده بدو فلوس فروختی، روزی سواری هیزم بزور گرفته دو سه تازیانه زد، خاموش شده بسرای خود آمده، بتقریبی آن سپاهی خادم خود را همان وقت دشنام

داد، خادم مخدوم را بکشت، از آنروز هیزم فروشی موقوف نموده در عبادت الٰهی مشغول بود و یك تنکه از غیب زیر سجاده موجود می شدی خرچ متعلقان کردی، روزی اہلیه حضرت شاه جنید یك فلوس داشته و یك فلوس بخرچ آورده ، روز دیگر تنکه که از غیب حاضر می شد موقوف شده۔(۴)‘‘

حضرت جنید روحانیؒ کی کرامات میں سے ایک اور کرامت کا ذکر اکثر ملتا ہے کہ ایک مرتبہ موہان تشریف لے جانا ہوا موہان کے پاس سے سئی نام کی ایک ندی گذرتی ہے آپ حضرت اس ندی کے کنارے بیٹھ گئے اور یہ عہد کرلیا جب تک غیب سے کچھ نہ مل جائے میں کچھ نہ کھاؤں گا لہٰذا ندی میں تغیانی آئی اور روٹی اور حلوہ منہ کے قریب آیا تب آپ نے گذا غیبی کو نوش فرمایا اس واقعہ کا ذکر تذکرہ مشاہیر سندیلہ اس طرح کرتا ہے کہ:

’’ایک مرتبہ موہان تشریف لے جا کر سئی ندی کے کنارے یہ عہد کرکے بیٹھ گئے کہ جب تک خدا تعالیٰ نہ کھلائے گا کچھ نہ کھاؤں گا ایک ہفتہ گذر گیا ندی میں طغیانی آئی اور آپ کی کمر تک پانی پہنچ گیا ایک گروہ روٹی اور ایک پیالہ حلوہ برآمد ہوکر منہ تک آ گیا، اس وقت آپ کو اندیشہ گذرا کہ اب اگر یہ استعمال نہ کیا جاوے تو بے ادبی ہوگی اس وجہ سے اس کو نوش فرما لیا۔ اس کے بعد غیب سے آواز آئی کہ اے جنید اگر اب بھی نہ کھاتا تو ہم خود کھلاتے (۵)۔‘‘

اس واقعہ کا تقریباً انہی الفاظ میں ذکر مصنف بحر زخار (۶) نے بھی کیا ہے، آپ حضرت سماع کے قائل تھے اور سماع میں غلو فرماتے تھے۔ شاعری کا بھی ذوق تھا عربی، فارسی، ہندی میں غزلیات، رباعیات اور قصائد کہے۔ شروع میں لوگوں نے اس شعری ورثہ کو تبرکات سمجھ کر بستوں میں بند کر کے گھر کی زینت بنا کر رکھا مگر شاید اب لاعلمی کی بنا پر دست بردہ زمانہ ہو گیا کچھ شعر مختلف بیاضوں، تذکروں اور تاریخوں میں درج ہوکر محفوظ ہو گئے ہیں جن کو یہاں پیش کیا جا رہا ہے، ایک مناجات کے اشعار ملاحظہ ہوں:

الٰهی واقفی بر جان زارم
همیں دانی که جز تو ندارم
الٰهی خاطرم را جمع گردان
که مسکین و پریشان روزگارم
الٰهی رفته ام در خواب غفلت

کــــــه چـــنـــدیـــں ســـــال دم در انتــظـــــارم
الٰهـــــی چـــون عـــــزیــــزم کــــردی امـــــروز
مـــکـــن فــــردا نبــــرد خـــویــــــش خـــوارم
الٰهـــــی بـــــر جــــنـیـــــد آســــــان گــــردان
کـــــه ایــنســـت اصــل خــانــــه را چـــه کـــارم
وعـــده بـــــر ذمـــــــه کســـــــان قـــرض اســـت
فـــــــرض بـــــــاشـــــد ادای آن کـــــــردن
ای کـــــــز آلـــــودگـــــی تـــــو شـــــب و روز
فـــــاقـــــــه و فـــقـــــر تـــــو زیـــــاده شـــــود
بـــــی طهـــــارت مبـــــاش تـــــا بـــــر تـــو
روزئ تـــــــنـــگ تـــــو کـشـــــــــاه شـــــود

آپؒ کے ''تحفۃ المواہب'' نام کے ایک رسالہ کا بھی پتہ چلتا اس رسالہ کے مطابق ایک مرتبہ آپ عالم رویا میں اپنے پدر عالی قدر کے ذریعہ انوار الہٰی اور حضرت محمد ﷺ کا دیدار کا شرف حاصل ہوا بیدار ہو کر تمام مشاہدات اور گفتگو کو من وعن رسالہ میں درج کیا اور اس سعادت کی تاریخ ۲۲/ محرم الحرام ۱۰۲۶ ہجری بھی درج کی ہے۔ مصنف تذکرہ مشاہیر سندیلہ، جناب نور الحسن ہاشمی صاحب نے اس رسالہ کی ایک نقل کا دیدار کیا (۷) جو کہ عہد عالمگیر کی تھی اس پر عبارت لکھی ہوئی تھی:

" ختم شد نقل رسالہ رویائی صالحہ روز دو شنبہ چھاردھم ذی الحجہ ۱۱۰٤ ھجری در عھد اورنگ زیب بادشاہ غازی (۸)۔"

اب یہاں ایک اختلاف یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ رسالہ کو نقل کرنے والا اسے رویائے صالحہ کے نام سے موسوم کر رہا ہے اور مصنف تذکرہ مشاہیر سندیلہ اس کا نام ''تحفۃ المواہب'' کر رہے مگر افسوس کہ اصل و نقل دونوں کا اب تک کوئی علم نہ ہو سکا اس لئے نام کے اختلاف پر بحث کو طول نہیں دیا جا سکتا، البتہ رسالہ کے چند اشعار آپ کی خدمت میں پیش کئے جا رہے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

مشـــو مـــنـــکـــر گـهـــی دیـــدار حـــق را
کـــــه مـــومـــن بـــنـــگـــر در خـــــار حـــق را

بچشم خویشتن دیده جنیدا
محمدؐ نور موسیٰؑ نار حق را
جنیدا باش در فکر الٰہی
بکن ذکر خدا چندان کہ خواہی
غم روزی مخور چوں شخص نادان
کہ روزی می رسد خواہی نہ خواہی
اللہ اللہ کہ خدا را دیدم
اللہ اللہ کہ چہ خوش گردیدم
افضل ذکر کہ تلقین کردہ
از دل و جان خودش درزیدم
گفت گشتم ز مشائخ راضی
چوں ز احوال ہمہ پرسیدم
یاد کردم چو گناہ خود را
دہ کہ از سر بقدم لرزیدم

سندیلہ کے معروف صوفی، مصلح اور جید عالم دین، خلیفہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ، حضرت مخدوم سید علاء الدین جاجنیری صاحب ولایت سندیلہ کی شان میں کہے گئے کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

☆الٰہی از میان ہر پردہ بردار
پس آنگہ رو برو بنمای دیدار
توی با من کن از غیبی عنایت
ز خواب غفلتم ہر لمحہ بیدار
خدایا چون جنیدم کن موحد
بھر عالم بگو کردار کردار
منم دیدار میخواہم وصالت
ای جنیدؒ آنکہ شد ولی اللہ

دوستـــان خـــدا بـــودنـــد ایشـــان
نـــمـــی خـــواهـــم دنیـــائـــی غـــدار
متـــقـــی مـــومـــن و مســـلـــمـــان اســـت
زانـــکـــه قـــرآن دلیـــل بـــرهـــان اســـت
٭دائـــی تـــلـــویـــن تـــمـــکـــیـــن مـــالك مـــلك یـــقیـــن
بـــنـــدگـــی مـــخـــدوم مـــولانـــا عـــلائـــی حـــق و دیـــن
عـــقـــلـــی و نـــقـــلـــی چـــو ابـــجـــد پیـــش او از بهـــر آنـــکـــه
عـــالـــم عـــلـــم لـــدنـــی بـــود چـــون روح الامیـــن
انـــه عـــلامـــه لـــلـــعـــلـــم مـــن کـــلّ انـــام
کیف لـــم یـــعـــلـــم کـــذا قـــد کـــان خیـــر الـــواصـــلیـــن
چـــون اشـــاره بـــا اشـــارت ســـاختـــه دیـــوار را
گشـــت جـــاری از تـــرب الـــحـــمـــد الـــلـــه الـــعـــالـــمیـــن
او خـــلافـــت یـــافـــت از خـــواجـــه نـــصیـــر الـــدیـــن کـــه خـــلـــق
کـــلـــهـــم کـــا نـــو مـــریـــدیـــن و هـــذا خیـــر الـــمـــرشـــدیـــن

حضرت شاہ جنید اپنے کشف قبور کی مہارت کی وجہ سے ''روحانی'' اور ''جنید ثانی'' کے لقب بھی مشہور ہوئے آپ کا وصال ۷/رمضان المبارک ۱۰۵۰ ہجری کو ہوا اور قصبہ کے المیہ باغ کی مسجد میں آپ کا مزار واقع ہے جو کہ آج بھی مرجع خلائق ہے۔

مولوی حسین علی:

مولوی حسین علی کے والد کا نام شیخ غلام مرتضٰی تھا اوران کا اصل وطن صفی پور ضلع اناؤ تھا۔ حضرت مخدوم عبد الصمد المعروف مخدوم شاہ صفی قدس سرہ صفی پوری کی ہمشیرہ کی اولاد میں ۔اس طرح آپ کا سلسلہ نسب عبداللہ بن فاروق اعظمؓ تک پہنچتا ہے۔ بوجہ ننہالی قرابت کے چار پشتوں سے آپ کے بزرگوں کی سکونت سندیلہ تھی اوراسی قصبہ میں ۱۲۴۰ھ میں ولادت ہوئی۔ اپنے عالم وفاضل باپ اور علمائے فرنگی محل سے علوم عربی وفارسی میں مہارت حاصل کی اس کے قصبہ میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا بہت شاگرد ہوئے ۔مولوی صاحب کو شاعری کا بڑا شوق تھا فارسی میں مکمل دیوان تھا لیکن اب دستیاب نہیں ہے۔ ان تصانیف میں رسالہ چہل کاف اور آمدنامہ منظوم زیادہ مشہور ہیں ۔سلسلہ قادریہ میں آپ کو

حضرت شاہ محمد احسن سرہندی بختیارنگری سے بیعت تھی اور سلسلہ قادریہ چشتیہ اور سہروردیہ میں آپ حجرت شاہ خادم صفی صفی پوری سے بھی بیعت تھے اور صاحب اجازت بھی تھے آپ نے قصبہ ملاواں میں انتقال فرمایا اور وہیں دفن ہوئے۔

ماخذات:۔

(۱) تذکرہ مشاہیر سندیلہ۔ص ۳۸

(۲) بحرزخار۔ص ۴۰۵

(۳) تذکرہ مشاہیر سندیلہ،ص ۳۸

(۴) بحرزخار۔ص ۴۰۵

(۵) تذکرہ مشاہیر سندیلہ۔ص ۳۹

(۶) بحرزخار۔ص ۴۰۵

(۷) تذکرہ مشاہیر سندیلہ۔ص ۴۰

(۸) ایضاً۔ص ۴۰

کتابیات

ماخذات:

تذکرہ مشاہیر سندیلہ، احمد علی سندیلوی

تذکرہ روز روشن

تذکرہ مشاہیر کاکوری

تذکرہ سفینہ بی خبر

dictionary of indo persian

☆☆☆

غزالہ حفیظ
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
دانش گاہ جواھر لال نھرو، نئی دہلی

تذکرہ نویسی کا فن

تذکرہ نویسی کا فن

تذکرہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ''یاد دہانی'' اور ''یاد آوری'' کے ہوتے ہیں اس کے علاوہ سرسری طور پر ذکر کرنے کو بھی تذکرہ کہا جاتا ہے اسی لیے اردو زبان میں یاد کرنے کے معنی میں ایک فقرہ ''بر سبیل تذکرہ'' عام طور پر بولا جاتا ہے جس کا مطلب دوران گفتگو کسی شخص یا واقعہ کا بس یونہی ذکر کرنا، ذکر ہونا یا ذکر آجانا ہے ہیں فارسی زبان میں اس کلمہ کے معنی ''یاد آوردن''، ''پند دادن''، ''یادگار''، ''یادداشت''، ''شہادت سفر''، ''گذرنامہ'' اور ''کتابی کہ احوال شعراء نوشتہ شدہ باشد'' وغیرہ کے معنی میں مستعمل رہا ہے اور اردو میں یہ لفظ ''دستاویز''، ''آٹوگرافی''، ''آپ بیتی''، ''یادرکھنا''، ''سرگذشت''، ''سفر کا ٹکٹ''، ''سوانح عمری''، ''ذکر مذکور''، اور ''تاریخ واقعات'' وغیرہ کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے ، دائرۃ المعارف اسلامیہ میں مذکورہ بالا معانی کے علاوہ ایک خاص معنی کا اضافہ اور دیکھنے کو ملتا ہے کہ زمانہ قدیم میں قاضیوں کو ایک مخصوص عہدہ قضا تفویض ہوتا تھا بوقت تفویض انھیں ایک سند بھی عطا کی جاتی تھی جس کو تذکرہ کہا جاتا تھا، بہر حال اگر اس کے مروجہ اصطلاحی معنی پر غور کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ عام طور پر تذکرہ ان کتابوں کو کہا جاتا ہے جن میں شاعروں کے سوانحی حالات اور ان کے کلام کے بارے میں مختصر طور پر بیان کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا جائے شاعروں کے سوانحی حالات اور شعری خصوصیات کے علاوہ تذکرے کا اطلاق ان کتابوں پر بھی کیا جاتا ہے جن میں شاعروں کے علاوہ اولیا، صوفیہ، علماء، فضلا، اطبا اور دیگر علوم وفنون سے تعلق رکھنے والی معزز ومحترم، مشہور ومعروف اور نا مور ونادر شخصیات کے حالات زندگی کو بھی احاطہ تحریر میں لایا گیا ہو ''تذکرۃ اولیاء''، ''تذکرۃ الفقراء'' اور ''تذکرہ حسینی'' وغیرہ اسی قبیل سے تعلق رکھنے والے تذکرے ہیں جن میں شاعروں کے علاوہ دیگر علوم وفنون سے تعلق رکھنے والے اہل ہنر اور بزرگان دین کے احوال وافکار اور کرامات وبرکات کو بھی احاطہ تحریر میں لایا گیا ہے بعض اوقات تذکرہ لفظ بڑا پیچیدہ، غیر واضح اور مبہم محسوس ہوتا ہے اس سلسلے میں اردو ادب کے مشہور ومعروف دانشور ڈاکٹر حنیف نقوی کی ایک عبارت کو نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ کس قسم کی کتابوں کو تذکرہ کی فہرست میں رکھا جاسکتا ہے۔

''مروجہ اصطلاحی معنی کی روشنی میں صرف وہی کتابیں تذکرہ کی تعریف میں آتی ہیں جن میں شعراء کے حالات اوران کے کلام کے نمونے پیش کیئے گئے ہوں ،دوسرے الفاظ میں یہ دونوں عناصر مختصر حالات اور منتخب کلام، اس ادب کے لیئے ناگزیر ہیں جن کی مربوط اور متوازن آمیزش کے بغیر کسی تصنیف کو تذکروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا، حالات کے تحت تذکرہ نگار شعراء کے نام اور تخلص وطن اور جائے قیام ،علمی وفنی استعداد، شاگردی واستادی کے روابط، مزاج وطبیعت کی افتاد، تصنیفی وتالیفی کارناموں کی نوعیت اورکلام کے مذاق ومعیار کے متعلق ابتدائی قسم کی ضرور معلومات فراہم کرتا ہے نمونہ کلام کے ذیل میں عام طور پر متفرق غزلوں کے منتخب اشعاراور کبھی کبھی دوسری اصناف سخن کے اقتباسات بھی پیش کیئے جاتے ہیں،ترتیب کے اس بنیادی اصول کو برقرار رکھتے ہوئے اگر کسی کتاب میں محض ہر شاعر کے نام اور تخلص کے ساتھ مختلف شاعروں کا کلام یکجا کر دیا جائے تو اسے تذکرہ کے بجائے بیاض کہا جائے گا جبکہ زندگی اور شخصیت کے تفصیلی مطالعے اور کلام کے متعلق بحث کی صورت میں ایسی کتاب تاریخ ادب کی تعریف میں آئے گی''۔۱

مندرجہ بالا سطور کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اس فن کے کچھ اصول ہوتے ہیں اور اگر ان میں سے کسی ایک اصول کو بھی نظر انداز کر دیا جائے تو پھر ایسی کتابوں کو تذکروں کے زمرہ میں نہیں رکھا جا سکتا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر مجید بیدار نے تذکرہ لفظ کو اور بھی زیادہ واضح اور سہل انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ اپنے تحقیقی مقالے ''دکنی تذکرے ''میں صنف تذکرہ کے بارے میں اپنی رائے قلم بند کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تذکرہ ایک ایسی صنف ہے جس میں فن کے جلیل القدر اصحاب کی سوانح اورانفرادی خصوصیات کو واضح کیا جاتا ہے اس اعتبار سے تذکرہ کا فن ایک کتاب کا محتاج ہوتا ہے یعنی جب تک کئی اہم شخصیات کو مربوط نہ کیا جائے اس کی حیثیت تذکرہ کی نہ ہوگی ۔۔۔۔تذکرہ کے فن کے لیئے سب سے بڑی ضرورت اشخاص کے حالات اوران کے کارناموں کو جمع کر کے اسے کتابی شکل دینا ہے جب تک اس اصول کی تکمیل نہیں ہوگی کوئی بھی تحریر شدہ متن تذکرہ کے ضمن میں شامل نہیں ہوگی''۔۲

تذکرے کسی بھی زبان وادب کا بڑا اہم ،وقیع اور گرانقدر سرمایہ ہوتے ہیں بالخصوص اردو زبان وادب میں تو ان کی بے پناہ اہمیت کو نظر انداز کیئے جانا کسی بھی صورت میں ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ ان تذکروں کے دقیق مطالعے کے

بغیر نہ تو اردو شعروادب کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے، نہ ہی ادبی نقد کے آغاز وارتقاء کی درست تاریخ وترتیب کا تعین کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس زبان وادب کی ابتداوارتقا کے سلسلے میں کوئی حتمی رائے پیش کی جاسکتی ہے یہ تذکرہ نویسی کا ہی اعجاز ہے جس کی وجہ سے ایسے بے شمار شعراء اوران کے احوال وآثار بے نام ونشان ہونے سے بچ گئے جن کے ادبی کارنامے یا تو جریدۂ عالم پر اپنا نقش دوام ثبت نہ کرسکے یا پھر کسی اور وجہ سے مدون ہونے کے باوجود بھی ضائع ہوکر صفحۂ قرطاس سے اپنا نام ونشان محو کر بیٹھے ہیں مثلاً اگر عصر حاضر میں سدیدالدین محمد عوفی کا مشہور زمانہ تذکرہ یعنی ''لباب الالباب'' ہماری دسترس میں نہ ہوتا تو ہم ساتویں صدی عیسوی کے متعدد شاعروں کے احوال وآثار سے یکسر لاعلم اور لاتعلق رہتے کیونکہ اس تذکرے میں بیان شدہ زیادہ تر شاعروں کے احوال وآثار دستبرد زمانہ کے سبب نابود ہوچکے ہیں اور کسی اور ماخذ سے ان کے حالات وکلام کے سلسلے میں کسی بھی قسم کی کوئی خاص معلومات فراہم نہیں ہوتیں ہیں اس کے علاوہ اس تذکرے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں شعروشاعری کے متعلق کیا نظریات قائم تھے تذکرہ نویسی کی بے پناہ اہمیت وارزش کو مندرجہ ذیل سطور کی روشنی میں بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔

۱۔ اس فن کا سب سے بڑا، اہم اور پہلا فائدہ یہ ہے کہ بیشتر تذکرہ نویسوں نے معاصرین شاعروں کے متعلق ہی بڑی جالب، کارآمد اور پرارزش معلومات فراہم کی ہیں جو دیگر تاریخی کتابوں کے ذریعے حاصل نہیں ہوتیں ان تذکروں کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں شاعروں کے اخلاق وعادات، مقام ومرتبہ اور شاعرانہ اہمیت وعظمت کا اندازہ لگا پانا قدرے سہل ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس عہد کے شعری میزان ومعائیر کا اندازہ لگانے میں بھی قدرے آسانی ہوتی ہے۔

۲۔ زیادہ تر تذکرہ نویس بذات خود بھی بڑے شاعر رہے ہیں اور شاعر ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق شاعروں کے کلام پر جو اظہار خیال کیا ہے وہ تنقیدی نقطہ نظر سے بڑا اہم اور مورد تفکر ہے جن کے ذریعے بعد کے ناقدین ادب کی انتقادی صلاحیتوں کو جلا حاصل ہوئی حالانکہ ان کا یہ اظہار خیال صدفی صد تنقید کے زمرہ میں تو نہیں رکھا جا سکتا ہے لیکن بغیر اس کو ذہن میں رکھے فن نقد کی تاریخ کو مرتب کرپانا بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ بھلے ہی ان تذکرہ نویسوں نے کلام شعراء پر اظہار خیال کرتے وقت اپنے وجدان اور ذوق کو پیش نظر رکھا ہو لیکن بعض اوقات بڑے اہم، فکر انگیز اور پرارزش انتقادی نکات پیش کیئے ہیں جو یقیناً بعد کی ادبی نقد کے لیئے بڑے اساسی اور اہم ثابت ہوئے ہیں۔

۳۔ کچھ تذکرہ نویسوں نے شاعروں کے کلام پر اصلاحیں بھی پیش کی ہیں اور بعض مواقع پر شاعروں کے کلام میں معمولی ترمیم وتغیر بھی کیا ہے ان کی برمحل اصلاحیں بڑی دقیق اور بصیرت افروز ہیں جن کی مدد سے شاعروں کے کلام میں موجود معائب ومحاسن صفحات پر جلوہ افروز ہوکر اذہان کو جلا بخشتے ہیں اور ان شعراء کے کلام کو سمجھنے اور اس کا درست مقام

ومرتبہ کا تعین کرنے مدد ملتی ہے ان اصلاحوں کے سبب بھی اردو شعروادب کی آرائش وزیبائش میں خصوصی مدد ملی اوراس میں یک گونہ سدھار اور نکھار پیدا ہوا۔

۴۔ تذکروں کا ایک اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان تذکروں کے مطالعے سے قاری کو طول وطویل دواوین کی تلاش وجستجو کی زحمت سے نہیں اٹھانا پڑتی اگر وقت کی قلت،ضخامت دواوین یا اور کسی اور وجہ ہے قاری شاعر کے پورے کلام کا مطالعہ نہیں کر پاتا تو وہ ان تذکروں کی مدد سے کسی بھی شاعر کے کلام کے متعلق بآسانی کوئی بھی رائے قائم کرسکتا ہے اوراس طرح اس کو ضخیم دواوین کے مطالعے کے لیئے طویل وقت کی زحمت سے آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔

۴۔ تذکروں میں بعض اوقات ایسی کتابوں کے اقتباسات بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں جو دستبرد زمانہ کے ہاتھوں فنا ہوگئیں ہیں اور جن کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ہمارے پاس کوئی اور ذریعہ موجود نہیں ہے لہٰذا ان تذکروں میں نقل شدہ اقتباسات کی مدد سے ہم ان تصنیفات وتالیفات میں پیش کیئے گئے بعض سودمند اور منفعت بخش نتائج کو حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔

۵۔ الگ الگ عہد میں ترتیب دیئے گئے تذکروں کے تقابلی مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگانے میں بھی آسانی ہوتی ہے کہ گزرتے وقت کے ساتھ ادبی رجحانات میں کیا تغیرات اور تبدیلیاں رونما ہوئیں اور عہد بہ عہد زبان نے کس طرح اپنی ارتقائی کی منازل کو طے کیا اور شعروادب کون سے نشیب وفراز سے گزرنے کے بعد اس قابل ہوا کہ دیگر زبانوں کے شانہ بہ شانہ چل سکے۔

۶۔ بعض تذکرہ نویسوں نے تذکروں کی تالیف کے داران اپنے حالات کو بھی تفصیلی یا مختصر طور پر قلم بند کردیا ہے جن کے بارے میں دیگر ذرائع سے پتہ نہیں چلتا بعض اوقات تذکرہ نگاروں نے کسی شاعر کے حالات وواقعات قلم بند کرتے وقت اپنی زندگی اور شخصیت کے کسی اہم پہلو کی طرف بھی اشارہ کر گئے ہیں ان کے یہ اشارات بعض اوقات بڑے ہی پرارزش اور منفعت بخش ثابت ہوئے ہیں اور جن کے بارے میں کسی دوسری کتاب سے کوئی رہنمائی حاصل نہیں ہوتی ہے۔

۷۔ تذکرہ نویسی کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ بعض ہوشمند اور ذی فہم تذکرہ نویسوں نے نہ صرف یہ کہ شاعروں کے احوال وآثار کو قلم بند کیا ہے بلکہ اپنے عہد کے بعض اہم سیاسی اور تاریخی واقعات کو بھی بیان کردیا ہے جو مورخین کے لیئے ہی نہیں بلکہ عام لوگوں کے لیئے بھی اس عہد کی تاریخ جاننے کا مستند اور معتبر ماخذ تصور کیئے جاتے ہیں۔

۸۔ تذکروں میں شاعروں کے اکثر ایسے اشعار بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں جن کو شاعر نے یا تو بذات خود معیار سے پست قرار دے کر اپنے کلام سے خارج کر دیا تھا یا پھر کسی اور وجہ کے تحت وہ اس کے مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہوسکے اور ستم

ظریفی زمانہ کے پیش نظر اپنے نقوش محو کر چکے ہیں لیکن تذکروں کی زینت ہونے کے سبب ان کو بقائے دوام حاصل ہوگیا متعدد ایسے شاعر ہیں جن کا کلام یا تو ضائع ہوگیا یا پھر کسی دوسرے شاعر سے منسوب ہوکر شہرت پا گیا لیکن ان تذکروں کے سبب ہی ان لغزشوں اور غلطیوں کی اصلاح ممکن ہوسکی ہے

۹۔ تذکروں کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان کے ذریعے حالات زمانہ کی بڑی اچھی اور سچی عکاسی ہوتی ہے ان کی کمک سے مخصوص عہد یا دور کی طرز معاشرت وثقافت، تہذیب وتمدن اور زبان وادب کے معیار و میزان کے متعلق بہترین اور صحت مند رائے قائم کرنے میں بھی آسانی ہوجاتی ہے یعنی تذکرے عام طور پر اپنے عہد کی علمی، ادبی، سیاسی، اقتصادی، تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں جن کی مدد سے قاری اس عہد کی پوری تصویر کو اس طرح دیکھ لیتا ہے جیسے کسی فلم کے مناظر یک بعد دیگرے اس کی نظروں سے گزر رہے ہیں اور وہ پوری طرح ان میں محو و مستغرق ہوکر اسی عہد کا ایک حصہ بن چکا ہے۔

۱۰۔ تذکروں میں محض شاعروں کے حالات اور انتخاب کلام ہی کو یکجا نہیں کیا جاتا بلکہ بعض تذکروں میں صوفیائے کرام، عرفائے عظام، بزرگان دین اور اکابرین ملت کے علمی وادبی کارنامے اور ان کی کمالات وکرامات کو بھی متعارف وروشناس کرایا جاتا ہے اور ان کی حیات وخدمات کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے جو تاریخی، تبلیغی، علمی اور تہذیبی ہر اعتبار سے لائق استفادہ اور سزاوار تفکر تصور کیئے جاتے ہیں اور ان کے ذریعے ہمیں اپنے بزرگان دین اور اکابرین ملت کی کرامات اور برکات کے بارے میں بڑی بیش قیمت اور پر ارزش معلومات فراہم ہوتی ہیں۔

اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عربی زبان وادب میں سب سے پہلے تذکرہ نگاری کی باقاعدہ شروعات ہوئی یہ شروعات اس وقت ہوئی تھی جب کہ اس غنی وثروتمند زبان کی شعروشاعری اپنے دور شباب کی انتہائی حدود تک پہونچی ہوئی تھی اور دنیا کی دیگر زبانوں کے مقابلے عربی ادب میں شعروشاعری کے بہترین اور اعلیٰ نمونے وجود میں آکر اذہان وقلوب کو فرحت ومسرت کی متاع بے بہا سے سرفراز بلکہ سرابور کررہے تھے، عربی زبان وادب میں تذکرہ نویسی کی یہ ادبی صنف قدیم زمانے سے ہی موجود تھی لیکن ان میں عام طور پر تذکروں کے لیئے ''طبقات'' کا لفظ بروئے کار لایا جاتا تھا عربی میں تذکرہ نگاری کی باقاعدہ اور باضابطہ شروعات ابن سلام کی کتاب ''طبقات الشعراء''، محمد بن حبیب کی کتاب ''طبقات الشعراء'' اور ابن قتیبہ کی تالیف ''الشعر والشعرا'' وغیرہ جیسی اہم کتابوں سے ہوتی ہے عربی زبان وادب سے ہی تذکرہ نویسی کی یہ روائت فارسی زبان میں منتقل ہوئی اور عربی کے زیر اثر بے شمار فارسی تذکرے مرتب کیئے گئے۔

عربوں نے ایرانیوں پر تقریباً دوسوسال تک حکومت کی تھی اور حاکم قوم نے محکوم قوم پر ظاہری ہی نہیں بلکہ معنوی اثرات مرتب کیئے تھے ایرانیوں کے ہمہ شعبہ ہائے زندگی پر عربی نقوش واضح طور پر دیکھے جاسکتے تھے تقریباً تمام ایرانی علوم

وفنون پر بھی عربوں کے گہرے اثرات تھے حتیٰ کہ فارسی زبان وادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا بہترین تہذیب وتمدن اور علم وادب کے دعویدار ایرانی قوم نے ادب کی مختلف اصناف میں عربی ادب کی تقلید پر اکتفا کر لینا زیادہ مناسب خیال کیا، جیسا کہ قبلاً ذکر کیا گیا ہے کہ فارسی زبان وادب میں تذکرہ نگاری کی روائت عربی تذکرہ نگاری کی مرہون منت ہے یعنی ایرانی تذکرہ نویسوں نے عرب تذکرہ نویسوں سے متاثر ہو کر ہی تذکرہ نویسی کے فن پر توجہ کی عربی زبان میں اس ادبی صنف کا آغاز فارسی کے مقابلے صدیوں پہلے ہو چکا تھا اور بڑے مشہور ومعروف کتابیں اس فن کے متعلق تحریر کی جا چکیں تھیں لہٰذا فارسی تذکرہ نویسوں نے براہ راست عربی تذکرہ نگاروں کے اثرات قبول کیے فارسی زبان میں لکھے گئے بیشتر تذکرے عربی تذکروں کے خوشہ چین معلوم ہوتے ہیں حالانکہ بعد میں ایرانیوں نے اپنے رنگ وآہنگ اور ذوق ورجحان کو ان میں شامل کیا اور بہترین تذکرے تالیف کیئے لیکن ان کے یہاں تذکرہ نویسی کی روائت بہت دیر میں شروع ہوئی جس کے سبب اہل ایران کے یہاں یہ روائت بہت محکم ومستحکم نہ ہو سکی، فارسی تذکرہ نویسوں نے عرب تذکرہ نگاروں کے تذکروں کی اہم خصوصیات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے یہ ہی وجہ ہے کہ فارسی زبان میں لکھے گئے بیشتر تذکرے عربوں کے طبقات سے گہری مماثلت رکھتے ہیں اگر ہم فارسی تذکرہ نگاری کی تاریخ کو دیکھیں تو یہ سمجھنے میں کوئی بھی دشواری نہیں ہوتی کہ فارسی کی تذکرہ نگاری سے مراد وہ تذکرہ نویسی کا وہ فن ہے جو عربی تذکرے کی روایت کا امین اور اسی کا تسلسل ہے یعنی جس وقت فارسی زبان میں تذکرہ نویسی کی شروعات ہوئی اس وقت تک عربی زبان میں کئی اہم اور مشہور تذکرے تالیف کئے جا چکے تھے مثلاً ''طبقات الشعراء''، تالیف ابن سلام، ''طبقات الشعراء''، تالیف محمد بن حبیب، ''یتیمۃ الدھر'' تالیف ابو منصور ثعالبی اور ''دمیۃ القصر وعصرۃ اہل العصر'' وغیرہ کئی تذکرے منظر عام پر آ چکے تھے اس کے بعد عربی زبان سے متاثر ہو کر فارسی میں بھی تذکرے لکھنے کی با قاعدہ اور باضابطہ شروعات ہوئی۔

شعراء کے سوانحی حالات، واقعات اور انتخاب کلام کے مجموعے کے لیے سب سے پہلے ''تذکرہ'' کا لفظ دولت شاہ سمرقندی نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الشعراء'' میں استعمال کیا ہے یہ تذکرہ ۸۹۲ ہجری میں مکمل ہوا اس کے بعد سام مرزا صفوی کا تذکرۂ تحفہ سامی ۹۸۳ ہجری میں منظر عام پر آیا اور پھر ایران کے متعدد دانشوروں نے صدہا تذکرے تالیف کیئے اور تذکرہ نویسی کی روائت کو آگے بڑھاتے ہوئے اس فن کو تقویت اور ثروت بخشی، لیکن یہاں اس بات کو نظر میں رکھے جانا ضروری ہے کہ فارسی تذکرہ نگاری فارسی زبان وادب کا وہ شعبہ ہے جس میں برصغیر ہندو پاک علماء وفضلا کی خدمات خود علمائے ایران پر فوقیت اور سبقت لے جاتی ہیں یہاں لکھے جانے والے فارسی تذکرے کمیت وکیفیت دونوں اعتبار سے کشور ایران میں وجود پذیر تذکروں سے پر نہ صرف اولیت بلکہ فوقیت اور ترجیع رکھتے ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اکثر ایرانی تذکرے ہندوستانی تذکروں سے ماخوذ ومستفاد ہیں اہل ایران کا بیشتر تذکروں کا ادبی سرمایہ ہندوستانی مصنفین

ومحققین کے ادب پاروں کا ہی مرہون منت ہے۔

فارسی زبان کے دستیاب شدہ تذکروں میں بہ اعتبار قدامت سدیدالدین محمد عوفی کے تذکرے ''لباب الالباب'' کو اولیت حاصل ہے یہ تذکرہ ۶۱۸ ہجری میں تالیف کیا گیا محمد عوفی پہلے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے فارسی زبان میں شعراء کے احوال مرتب کر کے تذکرہ نگاری کی باقاعدہ شروعات کی ''لباب الالباب'' کے بعد فارسی زبان وادب میں زیادہ تر تذکرے اسی تذکرے کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھے گئے ہیں خواہ وہ ایران میں تالیف کیے گئے ہوں یا پھر ہندوستان میں، جب ہندوستان میں مغلیہ حکومت کمزور ہونے لگی تو مرکزی حکومت کے زوال کے ساتھ ساتھ ساتھ فارسی زبان پر بھی زوال وانحطاط کے بادل منڈلانے لگے اور فارسی کی جگہ اب اردو زبان رائج ہونے لگی اور عوام وخواص اس نوخیز زبان کی آرایش وزیبایش کی جانب مائل ومتوجہ ہونے لگے اور شاعر وادیب اردو زبان وادب میں اپنی علمی وادبی تخلیقات پیش کرنے لگے چونکہ اردو زبان وادب فارسی کے سانچے میں ڈھل کر منظر عام پر آیا تھا چنانچہ اس پر اس زبان کے گہرے، ہمہ گیر اور راسخ اثرات مرتب ہوئے فارسی زبان کی بے شمار اصطلاحات وترکیبات، محاورات وترکیبات اور تشبیہات واستعارات وغیرہ اس نوزائیدہ زبان میں شام ہو کر اسی کا حصہ ہو گئے اور یہ ہی سبب ہے کہ جب اردو زبان میں تذکرہ نگاری کی ابتدا ہوئی تو اردو تذکرہ نویسوں کے سامنے فارسی زبان وادب کے بہترین اور گرانقدر تذکروں کا ایک بیش قیمت خزانہ موجود تھا لہٰذا اردو زبان کے تذکرہ نگاروں نے اسی زبان کے تذکروں کو نمونہ تقلید قرار دیتے ہوئے تذکرے لکھنے کی شروعات کی اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط سے اردو زبان میں تیزی کے ساتھ تذکرے لکھے جانے لگے ابتدائی دور میں جو بھی تذکرے لکھے گئے ان سب پر فارسی کے بڑے گہرے اثرات دکھائی دیتے تھے یہ تذکرے نہ صرف یہ کہ فارسی طرز پر تالیف کیئے گئے بلکہ عرصہ دراز تک ان کی زبان بھی فارسی ہی رہی ابتدائی دور کے تذکرے مثلاً ''نکات الشعراء''، ''گلشن گفتار'' اور ''تحفۃ الشعراء'' وغیرہ جیسے مشہور ومعروف تذکروں کی زبان فارسی تھی اردو زبان میں پہلا تذکرہ ''گلشن ہند'' ہے یہ تذکرہ ۱۸۰۱ عیسوی میں ترتیب دیا گیا تھا اس کے مصنف مرزا علی لطف ہیں اس تذکرے کو انھوں نے فارسی کے ایک مشہور ومعروف تذکرے ''گلزار ابراہیم'' سے ترجمہ وترمیم کر کے اردو میں مرتب کیا تھا اس کے علاوہ حیدر بخش حیدری نے بھی اردو زبان میں ایک تذکرہ تحریر کیا اور اس کے بعد محمد حسین آزاد نے اردو شعراء کا ایک تذکرہ ''آب حیات'' کے نام سے ترتیب دیا اس تذکرے کی اہم اور قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس مین شعرا کے سوانحی حالات کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی کے پہلو کو اجاگر کیا گیا اور کے بعد اردو تذکروں میں تازہ اور جدید رجحانات کو جگہ دی جانے لگی اور اردو تذکرہ نویسی کی روائت قوی سے قوی تر ہوتی چلی گئی دور حاضر میں اتنی وافر تعداد میں اردو زبان کے تذکرے منظر عام پر آ چکے ہیں جن کی صحیح تعداد بتا پانا بھی شائد مشکل ہو جائے اور دو تذکروں نے اپنی گونا گون صفات وخصوصیات کے سبب بہت جلد شہرت عام اور

بقائے دوام حاصل کرلیا، تذکروں کی مختلف النوع خصوصیات کی بنا پر ان کی مختلف قسموں میں درجہ بندی کی جا سکتی ہے اب ذیل میں ان تذکروں کی اقسام کو بیان کیا جا رہا ہے۔

۱۔ پہلی قسم میں وہ تذکرے آتے ہیں جن میں کسی مخصوص دور کے عظیم و بزرگ شاعروں کے احوال و واقعات کو تحریر کیا گیا ہے اور ان کے احوال و افکار کو بیان کرنے کے لیئے تحقیق بسیار اور جستجوئے زیاد کو بروئے کار لایا گیا ہے یہ تذکرے ادبی اور تاریخی دونوں اعتبار سے خصوصی طور پر توجہ طلب ہیں۔

۲۔ دوسری قسم میں وہ تذکرے آتے ہیں جن میں معروف و غیر معروف کا ذکر ملتا ہے یعنی ان تذکروں میں ان تمام شاعروں کو جگہ دی گئی ہے جن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ شاعر ہیں اور اگر ان کا تھوڑا بہت کلام بھی موجود تھا تو تذکرہ نویسوں نے ان کے کلام اور احوال کو اپنے تذکروں کی زینت بنایا ہے اور مختصر ہی صحیح لیکن ان کے کلام کے بڑے بہترین اور جالب نمونے پیش کیئے گئے ہیں بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی شاعر کے محض ایک یا دو شعر نقل کر دینے پر ہی اکتفا کر لیا گیا ہے کیونکہ ان کا زیادہ کلام دستیاب نہیں ہو سکا تھا یا پھر اگر ملا بھی تھا تو وہ بہت اعلیٰ درجے کا نہیں تھا لہٰذا اس کو قلم انداز کر دینا بہتر خیال کیا گیا ہے۔

۳۔ تیسری قسم ان تذکروں کی ہے جن میں شاعروں کے کلام کا انتخاب تو بڑی وافر تعداد میں ملتا ہے لیکن ان کی زندگی کے حالات و واقعات کو قلم بند کرنے کی طرف کوئی خاص توجہ مبذول نہیں کی گئی ہے ان تذکرہ نویسوں کا مقصد یہ رہا تھا کہ وہ شاعروں کا بہترین اور اعلیٰ کلام تفصیلی طور پر پیش کر دیں تا کہ ان کی شاعرانہ عظمت تمام لوگوں پر ظاہر ہو سکے لیکن حالات زندگی کو تفصیلی طور پر پیش نہ کرنے کی وجہ سے ان کے کلام کے پس منظر کو سمجھنے میں قدرے دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۴۔ چوتھی قسم میں کے وہ تذکرے ہیں جن میں اردو شعر و شاعری کو مختلف طبقات کے ذریعے درجہ بندی کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس قسم کے تذکرہ لکھنے والوں کا ہدف حقیقی یہ ہوتا تھا کہ اردو جو ابھی بالکل ایک نوخیز اور جدید زبان تھی اس کی ارزش و افادیت اور قدر و قیمت کو زیادہ سے زیادہ افزوں کیا جا سکے اور اس کو دیگر زبانوں کی شاعری کے مساوی مقام و مرتبہ حاصل ہو سکے اور اس زبان کو زیادہ سے زیادہ ثروت منداور پر ارزش بنایا جائے تا کہ دیگر لوگ بھی اس نوزائدہ زبان کی طرف مائل و راغب ہو سکیں۔

۵۔ پانچویں قسم ان تذکروں کی ہے جو کسی مخصوص دور یا زمانے سے تعلق رکھتے ہیں یعنی تذکرہ نویسوں نے یا تو معاصرین شاعروں کا ذکر بڑی شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے اور اپنے قلم کی تمام تر توانائی معاصرین شاعروں کی عظمت و وقعت ثابت کرنے پر صرف کر دی ہے یا پھر انھوں نے متاخرین شاعروں کے احوال و کلام کو قلم بند کرنے کی طرف ہی اپنی

توجہ مبذول رکھنے کی کوشش ہے اوران کے کلام کو معاصرین شاعروں کے کلام سے موازنہ ومقایسہ کرنے کی کوشش کی ہے اور معاصرین کے کلام پر متاخرین کی شاعرانہ عظمت کو ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے، چونکہ ان تذکروں میں از اول تا آخر شعرا کے انتخاب کلام کے بجائے صرف کسی ایک دور کے شاعروں کو موضوع تحریر بنایا گیا ہے اس لیئے ان میں تفصیل زیادہ مل جاتی ہے جو انتقادی، شعری اور تاریخی اعتبار سے مورد تفکر قرار دی جاسکتی ہے۔

۶۔ تذکروں کی قسم ششم میں وہ تذکرے سرفہرست ہیں جو ذاتی تعصب، شخصی اختلافات، آپسی تنازعات اور باہمی رنجشوں کے پیش نظر لکھے گئے ہیں یعنی اگر کسی تذکرہ نویس نے کوئی تذکرہ ترتیب دے دیا تو دوسرے کو فوراً اس سے اختلاف وبغض پیدا ہوگیا اور اس نے خود یا اپنے کسی شاگرد وغیرہ سے کوئی تذکرہ لکھوا کر گویا اس کو اینٹ کا جواب پتھر سے دے کر ذہنی یکسوئی اور عارضی خوشی حاصل کرنے کی کوشش خام کی ہے ذاتی تعصّبات اور شخصی اختلافات کے پیش نظر لکھے جانے والے یہ تذکرے انتقادی نقطہ نظر سے کافی اہم تصور کیئے جاتے ہیں کیونکہ ان میں تذکرہ نویسوں نے بھلے ہی اپنے وجدانی ذوق کے زیر کلام شعراء پر اظہار خیال کیا ہے لیکن اس اظہار خیال میں بعض اوقات بڑے بصیرت افروز انتقادی نکات بھی قلم وقرطاس کے سپرد کردیئے ہیں جنھوں نے آگے چل کر اردو ادب میں تنقیدی بنیادوں کو استوار اور توانا بنانے میں اساسی اور کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

۷۔ ساتویں قسم ایسے تذکروں کی ہے جو کسی ادبی یا وطنی گروہ کی نمایندگی کے پیش نظر لکھے گئے ہیں اور جن کا مقصد اپنے گروہ یا علاقے کی بلندی وعظمت کو ظاہر کرنا ہوتا تھا اس قسم کے تذکروں میں ایک چیز جو بڑی شدت کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے کہ اس قسم کے تذکرہ نویسوں نے ادبی دیانت اور علمی صداقت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے شاعروں کے کلام پر اپنی رائے پیش کی ہے اور اکثر اعتدال اور توازن کو اپنے پیش نظر نہیں رکھا ہے اور کسی مخصوص علاقے یا کسی گروہ سے منسلک لوگوں کی شاعرانہ عظمت کو ثابت کرنے کے لیئے زمین وآسمان کے قلابے ملا دیئے ہیں چاہے کوئی شاعر اعلیٰ درجے کا ہو یا نہ ہو لیکن اس کو دوسرے شاعروں پر ترجیح وفوقیت دینا گویا ان تذکرہ نویسوں کا فرض عین رہا تھا۔

۸۔ آٹھویں قسم میں وہ تذکرے جن کو تالیف کیئے جانے کا سب سے بڑا اور اہم محرک اپنے عہد کے تاریخی یا سیاسی واقعات وحالات کو بیان کرنا رہا تھا یا پھر ان تذکرہ نویسوں نے انتخاب کلام کے مقابلے شاعروں کے سوانحی احوال کو قلم بند کرنے کی طرف زیادہ توجہ مبذول رکھی ہے یہ تذکرے اس اعتبار سے زیادہ ارزشمند قرار دیئے جاسکتے ہیں کہ وہ حالات وواقعات جو دیگر کتابوں میں نظر انداز کردیئے گئے ہیں ان کے بارے میں ان تذکروں کے ذریعے اچھی طرح آگاہی حاصل ہوجاتی ہے۔

۹۔ نویں قسم میں وہ تذکرے رکھے جاسکتے ہیں جن میں تذکرہ نویسوں کی تمام تر توجہ شعراء کے کلام میں موجود صنایع

لفظی کو بیان کرنے کی طرف زیادہ صرف ہوئی ہے اور صنائع معنوی کو یکسر قلم انداز کر دیا گیا ہے حالانکہ شواہد سے ثابت ہے کہ کسی بھی شاعر کے کلام کے صحیح مقام و مرتبہ کا تعین اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے کلام میں موجود معنوی حسن کو اجاگر نہ کیا جائے لیکن اکثر تذکرہ نویسوں نے کلام شعراء کے معنوی حسن کو بیان کرنے کی طرف توجہ نہیں کی ہے، بہت کم تذکرے ایسے لکھے گئے ہیں جن میں شاعر کے کلام کی معنویت کو پوری ادبی سنجیدگی اور علمی دیانت کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہو بعض اوقات تو ان تذکرہ نویسوں کی تحریروں سے یہ اندازہ لگانے میں چنداں بھی دشواری نہیں آتی کہ وہ خود شاعری کی معنوی خوبیوں کے بارے میں بہت زیادہ جانکاری نہیں رکھتے تھے۔

۱۰۔ دسویں قسم کے تذکرے وہ ہیں جن، میں شاعروں کے اسلوب بیان کی توضیح وتشریح میں تذکرہ نگاروں نے بڑا ہی مبہم، الجھا ہوا اور غیر واضح انداز بیان اختیار کیا ہے جس کی وجہ سے شاعروں کے کلام کی حقیقی قدر و قیمت واضح ہونے کے بجائے مشکوک ہو جاتی تھی اس قسم کے تذکروں کو تالیف کیئے جانے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ تذکرہ نویس کی اپنی علمی اہمیت وفضیلت اس کے معاصرین پر واضح ہو جائے اور اس کی عالمانہ برتری کی دھاک تمام علمی وادبی حلقوں میں قائم ہو جائے لیکن اس قسم کے تذکروں نے ادب کو فائدہ پہونچانے کے بجائے نقصان پہونچایا ہے اور ان کی تحریریں چیستاں بن کر لوگوں کے اذہان کو مشوش و پریشان کرنے کے بجائے کچھ اور کارنامہ انجام نہیں دے سکی ہیں حالانکہ اور قسم کے تذکروں کی تعداد ادب میں نہ ہونے کے برابر ہے، مندرجہ بالا اقسام کے علاوہ بھی ڈاکٹر نیاز سلطان پوری نے ڈاکٹر مجید بیدار کے تحقیقی مقالے ''دکنی تذکرے'' کے حوالے سے تذکروں کی مندرجہ ذیل چھ قسمیں بیان کی ہیں جن کے بارے میں مختصراً بتایا جا رہا ہے:

۱۔ مذہبی تذکرے:

مذہبی تذکرے وہ ہوتے ہیں جن میں عام طور پر کسی دور یا کئی ادوار کے علما،عرفا،صوفیا،مبلغین اور مذہبی شخصیات وغیرہ کی حیات وخدمات اور برکات وکرامات کے متعلق گفتگو کی جائے، مذہبی تذکروں میں عموماً علما اور صوفیا کی مذہبی زندگی کو تفصیلی طور پر پیش کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان بزرگان دین کی کرامات وخدمات کے سلسلے میں بھی قدرے تفصیلی اور ذی قیمت معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ان تذکروں کو مذہبی اعتبار سے خصوصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

۲۔ ادبی تذکرے:

یہ وہ تذکرے ہیں جن میں تذکرہ نگاروں نے متقدمین اور متاخرین دانشوروں کے ادبی کارناموں موموضوع سخن بنایا گیا ہے اس قسم کے تذکروں میں عموماً مختلف شاعروں اور ادیبوں کی زندگی کو ترتیب وار بیان کیا جاتا ہے ان کے

حسب ونسب اور آثار واحوال پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی ہے ان تذکروں کی مدد سے سماجی اور اخلاقی اقدار پر بھی روشنی پڑتی ہے معاصرانہ چشمکیں، آپسی اختلافات اور شخصی تنازعات وغیرہ کے متعلق بھی بڑی دل چسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

۳۔ سماجی تذکرے:

سماجی تذکرے وہ تذکرے ہوتے ہیں جن میں کسی سماج یا سوسائٹی میں رہنے والے لوگوں کے ذریعے کیئے گئے مختلف النوع اصلاحی اور فلاحی کارناموں کے متعلق بڑی تفصیلی گفتگو کی جاتی ہے اور ان کے کارناموں کو بڑے زور وشور کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے لایا جاتا ہے ان تذکروں میں اکثر وبیشتر کسی قوم یا مذہب کے مختلف النوع طبقات کے نمائندوں کی یک جہتی، یگانگت، رواداری اور آپسی اخوت وانسانیت کے کارناموں کو گفتگو کا موضوع بنایا جاتا ہے۔

۴۔ انسائیکلوپیڈیائی تذکرے:

ان تذکروں میں عام طور پر شعرا کے احوال اور انتخاب کلام کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب وار قلم بند کیا جاتا ہے اس قسم کے تذکرے متنی کتب یعنی Reference Book کی اہمیت رکھتے ہیں یہ تذکرے دور جدید میں بڑی اہمیت وافادیت کے حامل قرار دیئے جاسکتے ہیں

۵۔ صنفی تذکرے:

ان تذکروں میں ایسی متن اور مواد کے یکجا کیا جاتا ہے جن میں شعراء کی سوانح اصناف نثر ونظم کے اعتبار سے مرتب کی جاتی ہے ان میں اصناف سخن مثلاً مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، اور غزل وغیرہ جیسے عنوانات قائم کر کے ان میں مرثیہ گو، قصیدہ گو، نظم گو اور غزل گو شاعروں کے واقعات زندگی صنف واری ترتیب وار پیش کی جاتی ہے (بدلو)

۶۔ آئینی تذکرے:

یہ وہ تذکرے ہوتے ہیں جن میں فن عروض اور قواعد کے متعلق تحریر کردہ تذکروں کو شامل کیا جاتا ہے، جن کتابوں میں فن عروض، علم ادب، الفاظ کے محاسن ومعائب اور اشعار کے اوزان کے بارے میں تفصیل درج ہوانھیں آئینی تذکرے کہا جاتا ہے ان میں علم بیان اور علم بدیع کا ذکر کیا جاتا ہے۔

تذکرہ نویسی نے بڑا فائدہ پہونچایا اس فن نے جو سب سے اہم کارنامہ انجام دیا وہ یہ تھا کہ ان تذکروں کے سبب ہزار ہا شاعر بے نام ونشان ہونے سے بچ گئے، اردو شعر وشاعری کی باقاعدہ تاریخ مرتب ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ تنقید نگاری کے لیئے نئی راہیں بھی ہموار ہوئیں جن کے ذریعے جدید ناقدین ادب کے اذہان کو جلا حاصل ہوئی اور اس طرح تذکرہ لکھنے کا آغاز اٹھارہویں صدی کے وسط میں شروع ہوا اور بتدریج آگے بڑھتا رہا اور شروع میں فارسی زبان میں تذکرے لکھے لگے اور پھر اس کے بعد اردو زبان میں تذکرہ لکھے جانے لگے اس صنف نے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کے

مدارج کو طے کیا فن تذکرہ نویسی کے بہت کم مدت میں بے انتہا ترقی حاصل کر لینے اور اس قدر عروج حاصل کرنے کے پس پشت بہت سے عوامل کارفرما تھے ان میں سے کچھ عوامل یا محرکات کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ تذکرہ نویسوں کو اس بات کی کی شدید خواہش ہوتی تھی کہ ان کے نام اور تخلیقات کو شہرت دوام حاصل ہو جائے لہٰذا انھوں نے بقائے دوام کی تمنا میں متعدد وہ تذکرے ترتیب دیئے ہیں جنھوں نے ادبی سرمایہ کو افزوں کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

۲۔ تذکرے ترتیب دیئے جانے کے پیچھے اکثر ایک قابل ذکر سبب یہ بھی رہتا ہے کہ تذکرہ نویسوں کے تحقیقی اور ادبی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم ہو سکے اور وہ اپنی تشنگی کی سیرابی کر سکیں ادبی اعتبار سے یہ تذکرے بڑے اعلیٰ اور بلند مرتبہ تصور کیئے جاتے ہیں۔

۳۔ بعض تذکرہ نویسوں کی خواہش ہوتی ہے کہ ارباب کمال اور اہل دانش کے آفاقی کارناموں کی جمع وتدوین کر کے انھیں ہمیشہ کے لیئے تاریخ میں جاویداں کر دیا جائے لہٰذا عظیم فنکاروں کی قدر شناسی اور ان کے ہنر قدردانی کے لیئے اس قسم کے تذکرے مرتب کیئے جاتے ہیں:

۴۔ تذکروں کو تالیف کیئے جانے کا بڑا محرک یہ بھی ہوتا تھا کہ شعری ولسانی روایات کی عہد بہ عہد ترقیوں کو تاریخی دستاویز کی صورت میں تحریر کر دیا جائے تا کہ آئیندہ نسلیں ان سے استفادہ کر سکیں اور ان کے تاریخی شعور کو جلا حاصل ہو۔

۵۔ بعض تذکرے ترتیب دیئے جانے کی وجہ آپسی رنجشیں اور رقابتیں بھی رہیں تھیں یعنی تذکرہ نویس آپسی رقابتوں کے پیش نظر بھی ایک دوسرے سے زیادہ بہتر تذکرے ترتیب دینے کی کوشش کرتے تھے تا کہ ان کی برتری اور فوقیت ان کے معاصرین پر قائم رہے اور انھیں کسی سے کم حیثیت نہ سمجھا جائے۔

۶۔ بعض اوقات ادبی گروہ بندی کے پیش نظر بھی تذکرے تالیف کیئے جاتے تھے یعنی اپنے ہم خیال اور ہمنوا لوگوں کی عظمت و برتری کو ثابت کرنے کے لیئے یا پھر اپنے احباب یا شاگردوں وغیرہ کی کثرت تعداد کو ظاہر کرنے کے لیئے بھی تذکرے تحریر کیئے جاتے تھے۔

۷ اکثر تذکرہ نویس اس لیئے بھی تذکرے مرتب کیا کرتے تھے کیونکہ ان کے عزیز واحباب و اقارب کی شدید فرمائش ہوتی تھی کہ وہ تذکرے تالیف کریں لہٰذا عزیزوں اور رفیقوں کی خواہش کے پیش نظر بھی اکثر تذکرے ترتیب دیئے گئے ہیں جن میں زیادہ تر بس واجبی سے ہیں اور ان کو بہت زیادہ عظمت وارزش حاصل نہیں ہو سکی ہے۔

۸۔ تذکرہ نویسی کے پیچھے ایک اور محرک جو بہت شدت کے ساتھ کارفرما نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ بعض اہل فہم اپنے سرپرستوں کی خشنودی اور ان کی حمائت حاصل کرنے کی غرض سے بھی تذکرے تحریر کرتے تھے تا کہ انھیں اپنے محسنین

اور مربیان کے نزدیک قدر و منزلت حاصل رہے اور انھیں معاصرین کے درمیان احترام و اعتبار قائم رہے۔

۹۔ مشاعروں کی حد سے زیادہ مقبولیت اور ہر دلعزیزی نے بھی تذکرہ نگاروں کو بہترین تذکرے لکھنے کے لیئے آمادہ کیا اور اس طرح مشاعروں کی گرم بازاری نے صنف تذکرہ کو خوب فروغ دیا۔

۱۰۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے لطف اندوزی اور فرصت کے اوقات کو کارآمد بنانے کی غرج سے بھی تذکرے تحریر کیئے ہیں اردو تذکروں کے دیباچوں میں اکثر ایسی تحریریں دیکھنے کو مل جاتیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے لکھنے والوں نے محض تفنن طبع کے لیئے اس فن کی طرف متوجہ و مائل ہوئے اور بہترین تذکرے ترتیب دیئے۔

> صنف تذکرہ نویسی نے جو عروج و آفاقیت عطا کی ہے وہ کسی بھی صاحب فہم سے پوشیدہ نہیں ہے اس ادبی صنف کی بے پناہ ارزش وافادیت ہے کہ آج یہ صنف قابل ہو سکا کہ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں موجود ادب کے شانہ بہ شانہ چل سکے اگر یہ تذکرے تالیف نہ کیئے گئے ہوتے تو شائد ادب کو اپنی اتنی واضح اور روشن شکل اختیار کرنے میں ایک طویل وقت درکار ہوتا صنف تذکرہ نویسی کی اہمیت و ارزش کا اعتراف ہر دور اور ہر طبقے کے دانشوروں کی طرف سے کیا جاتا رہے۔

یہ درست ہے بغیر تذکروں کے مطالعے کے یک گونہ تشنگی اور ادھورے پن کا احساس بڑی شدت کے ساتھ ہوتا ہے یہ ہی وجہ زبان وادب سے تعلق رکھنے والا ایک عاف فہم قاری بھی ان سے بے نیاز نہیں گزر اسکتا اور کسی نہ کسی صورت میں اس کو اس صنف کی اہمیت وافادیت کو ماننے پر مجبور ہونا پڑتا ہے حالانکہ ہمارے بعض دانشوران ادب نے تذکروں کی تاریخی افادیت کا تو اعتراف کیا ہے لیکن انتقادی اہمیت کا سرے سے انکار کیا ہے ان کے نزدیک تذکروں کو تاریخی اعتبار سے تو اہم مانا جاسکتا ہے لیکن انتقادی نقطہ نظر سے ان تذکروں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی ہے یہ ہی سبب ہے کہ کلیم الدین تذکروں کی انتقادی اہمیت دینے میں تامل کرتے ہیں بلکہ صاف طور پر ان کو زمرۂ نقد سے خارج مانتے ہیں اور اپنی رائے قلم بند کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اکثر شعرا کے کلام پر رائے زنی نہیں کی جاتی تھی تذکروں مین ہر جگہ الفاظ کا سیلاب رواں ہے یہ الفاظ کوئی خاص نقش دل و دماغ پر ثبت نہیں کرتے، تذکرہ نویس تنقید کی ماہیت، اس کے مقصد، اس کے صحیح پیرایہ سے بھی آشنا نہ تھے اس لیئے ان تذکروں کہ اہمیت صرف تاریخی ہے یہ دنیائے تنقید میں کوئی اہمیت رکھتے''۔۳

یہ درست ہے کہ ابتدائی دور میں جو تذکرے ترتیب دیئے گئے ان میں تنقیدی پہلو کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا

گیا اور ظاہر ہے رکھا بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ کسی ادب پارے کو تخلیق کرتے وقت تنقیدی شعور تو کارفرما ہوتا ہے لیکن اس کے اصول وقواعد اور آئین وضوابط ترتیب دینے میں خاصا طویل وقت درکار ہوتا ہے جس وقت تذکرہ نگاری کی ابتدا ہو رہی تھی ادبی تنقید کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا کلام شعرا کے معائب ومحاسن کو بیان کرنے کے لیئے کچھ مخصوص جملے وضع کر لیئے گئے تھے اور انھیں کے متعلق شاعروں کے کلا پر اظہار خیال کیا جا تا تھا اس کے علاوہ تذکرے لکھنے کی جس وقت شروعات ہوئی اس وقت وسائل بہت محدود تھے کتابوں کی ترتیب واشاعت ،وسائل کی کمی اور دیگر امور دور حاضر کی طرح موجود نہیں تھے لہذا اسی تناظر میں ہمیں اس دور کے ادب کو جانچنے وپرکھنے کی کوشش کرنا چاہیے اور یہ بھی نظر میں رکھنا ضروری ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں نے اٹھارہویں صدی سے تذکرہ نویسی کا آغاز کیا اور یہ وہ وقت تھا جب جدید تنقیدی نظریات وافکار سے پوری طرح نہیں تو بہت بڑی حد تک تو ناواقف تھا اور اگر میں یہ کہوں تو غلط نہیں ہوگا کہ تنقید تو تنقید خود اُردو نثر بھی تقریباً نہ ہونے کے ہی مساوی تھی ان تذکرہ نگاروں کے سامنے کوئی ادبی تنقید سے متعلق کوئی خاص نمونے موجود نہیں تھے زبان وبیان اور شعروشاعری دونوں اپنے ارتقائی مراحل میں تھے اس لیئے ان میں فن نقد سے متعلق کوئی توانا اور مستحکم اصول وضوابط متعین کر پانا بھی ممکن نہیں تھا سید محمد نواب کریم نے بالکل درست لکھا ہے:

> ''یہ تذکرے جس ادبی ماحول اور شاعرانہ فضا میں لکھے گئے ہیں اس میں آج کل کی طرح موضوع ومواد کو تو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں تھی بلکہ عربی وفارسی شاعری اور تنقید کے زیر اثر کلام کی ظاہری صورت ہی کو سب کچھ سمجھا جاتا تھا'' ۴؎

اردو زبان وادب نے چونکہ فارسی زبان وادب کی آغوش میں اپنی آنکھیں کھولیں تھیں بلکہ اسی کی دیکھ ریکھ میں پرورش بھی پائی تھی اور یہ ہی وجہ تھی کہ شعوری وغیر شعوری طور پر اس زبان وادب پر فارسی روایات کو قبول کر لیا چونکہ اردو تذکرہ نگاروں نے فارسی زبان کے تذکروں کو نمونہ بنایا تھا لہذا مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان کی شعروشاعری اور ادبی نقد کی تاریخ کو مرتب کرنے میں ان تذکروں نے کلیدی کردار ادا کیا ہے آج اردو ادب میں جو بیش قیمت اور گرانقدر سرمایہ اور ادبی نقد سے متعلق جو درخشندہ وتابندہ روایات نظر آتیں ہیں وہ کہیں نہ کہیں انھیں تذکرہ نگاروں کی محنت شاقہ ،بیدار مغزی اور دوراندیشی کی مرہون منت ہے حالانکہ ابتدامین جو بھی تذکرے ترتیب دیئے گئے ان میں بیشتر تذکروں پر فارسی تذکروں کے بڑے گہرے اثرات نظر آتے ہیں لیکن گزرتے وقت کے ساتھ اردو تذکرہ نگاروں نے اپنا ایک الگ رنگ وآہنگ اختیار کیا اور بہترین تذکرے مرتب کیئے۔

ماخذ ومنابع:

۱۔ ڈاکٹر حنیف نقوی، شعرائے اردو کے تذکرے، نسیم بک ڈپو لکھنؤ، صفحہ نمبر ۲۲۔۲۳
۲۔ ڈاکٹر مجید بیدار، بحوالہ اردو تذکرہ نگاری، پاریکھ آفسیٹ پریس، لکھنؤ، ۱۹۹۸، صفحہ نمبر ۱۰
۳۔ اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، صفحہ نمبر ۲۶
۴۔ سید محمد نواب کریم، اردو تنقید حالی سے کلیم تک، بلس آفسیٹ پرنٹنگ ورکس، نئی دہلی، ۱۹۹۳، صفحہ نمبر ۴۵

☆☆☆

محمد اقبال بابا
گرونانک دیو جی یونیورسٹی، امرتسر، پنجاب

حضرت شیخ سرمد ایک ہمہ جہت شاعر

حضرت شیخ سرمد کی شخصیت کے بارے میں تذکرۂ طاہر نصیر آبادی میں لکھا ہے:۔

''سعیدای سرمد تخلص گویا کاشیت یہود بود و مسلمان شد،طبعش خالی از لطف نیست، اما سودائی داشته به ہند رفته مسموع شد، کی کشف عورت کرده برہنه میگشت ،پادشاه اورا طلب داشته تکلیف لباس کرد، قول نه نموده منقیان فتوایٰ بقتلش دادند ،پادشاه ملا عبد القوی را که گویا از ماوراء نہر است فرستاد ،که حال اورا معلوم کند ہمیں که می بیآید وبا اورا میگوید که چرا ایں روش سر میکنی وبرہنه می باشی او میگوید که شیطان قوی است۔''

بعد ازیں ملا عبد القوی بخدمت بادشاه آمد و قتل بجویز او میکنند،یکی از حلالخواران مامور می شود که او بقتل رساند ،ہمیں که از دور پیدا میشود، میگوید که ایں چه چاره است که دیگر بکار ما میکنی و بر سر پائی می نشیند که گردنش را میزنند ،غرضکه بی نشه بنو و چرا که عاشق پسر راجه شده یعقوب جذبهٔ محبت او را بطرف خود کشیده ،چنانچه پدر ومادر و اسباب بسیار را گذاشته باتفاق او خاکستر نشین میشود ،بعد از قتل سعید را گویابسہل مدتی او ہم فوت شده مشہور است، که شاہزاده دارا شکوه تعریف او میکرد شاه جہاں فرمود که بیك گز کر پاس دہان خلق را میتوان بست''

کہا جاتا ہے کہ سرمد کا تعلق ایران کے علاقہ آرمینیا سے ہے[۱] اور آپ یہودی یا عیسائی مذہب کے پیروکار تھے،مولانا محمد حسین آزاد اپنی کتاب ''نگارستان فارس'' میں لکھتے ہے، سرمد یہودی تھے اور توریت وانجیل کو پہلے ہی پڑھ

چکے تھے،عربی اور فارسی اعلیٰ پیمانے پر ملاصدرالدین سیرازی اور ابولقاسم فندرسکی سے حاصل کی،اسلامی تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ آپ کو تلاش حق کی جستجو ہوگئی،بڑی فکر کے بعد آپ نے اسلام قبول کیا اور محمد سعید نام پایا ۲ تجارت ان کا پہلا اور محبوب پیشہ تھا، ۱۰۳۱ھ میں تجارت کی غرض سے ہندوستان کا سفر کیا،ان دنوں ہندوستان میں مغلیہ دور حکومت تھا، چنانچہ عرب اور ایران سے آنے والے تاجران کو سندھ کے بندرگاہ ٹھٹھ (کراچی) پر اترنا ہوتا تھا،اس لئے حکومت نے کراچی میں وہ تمام سہولیات سرکاری طور پر فراہم کردی تھیں،کہ جن سے ہر ایک تاجر کو واسطہ رہتا ہے،تجارت کے ساتھ ساتھ آپ یہاں کی علمی وادبی مجالس میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا کرتے تھے،اور یہاں کی ادبی صحبتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ یہیں پر سکونت اختیار کی،ایک مشاعرے کے دوران شہر پٹنہ میں ابھے چند نامی ایک لڑکے کی مترنم غزل سرائی سے آپ اپنے دل پر چوٹ کھا کر رہ گئے،اس واقعہ کے بارے میں صاحب مراۃ الخیال لکھتے ہے:۔

”در اثنای تجارت بشہر تتہ افتاد بر ھند و پسر عاشق گشت۔“

ابھی چند نے بھی آپ کی پاکیزہ محبت کا نہایت گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا،کچھ دنوں یہ سلسلہ چلتا رہا،لیکن رفتہ رفتہ محبت کی آگ نے دہکنا شروع کیا اور ابھے چند شیخ سرمد کے ساتھ ہی رہنے لگا،اس پر ابھے کے ورثہ کو تشویش لاحق ہوئی،انھوں نے حاکم شہر مرزا محمد بیگ بخشی کے اشارہ پر اپنے لڑکے کو چھپا لیا،جس سے حضرت سرمد کو بہت ہی زیادہ اضطراب اور بے چینی ہوئی،محمد بیگ نے آپ کے پاس درخواست بھیجی،کہ اس لڑکے کا تجسس نہ کریں،اس کے بدلے میں کوئی بھی خدمت بجالانے کو تیار ہوں،اس پر سرمد نے جواباً یہ رباعی لکھ کر بھیج دی۔

ای بادیگر بمسرزائی بخشی کامی کردہ ملك زیررایت رخشی
گفتی کہ کواکہ چو درم می چاشم خورشید مرا نیز بمن می بخشی

بخشی نے اس رباعی کو پڑھ کر خاموشی اختیار کی،مگر ابھے چند کو بھی اب حضرت سرمد کے بغیر قرار آنا مشکل ہوگیا،اس کے ورثہ نے جب یہ حالت دیکھی تو وہ بھی مجبور ہوگئے اور ابھے چند پھر سرمد کے ساتھ بدستور رہنے لگا،آپ نے انھیں وہ سارے علوم سکھا دیئے،جن سے وہ خود واقف تھے،اور مختصر مدت میں اسے بہترین عالم وفاضل اور شاعر بنا دیا،اس کے علاوہ معرفت کی منازل بھی طے کرائی،چنانچہ ان کا یہ شعر۔

ھم مطیع فرقانم ہم کشش دہبانم
ربی آہو دانم کافرم نہ مسلمانم

اس کے بعد انھوں نے ترک سکونت کی،اور لاہور آگئے،یہاں پر مسلسل گیارہ سال تک رہے،علم وعرفان کی بارش کرکے ۱۰۴۴ھ میں حیدرآباد (دکن) تشریف لے گئے،سفر کے دوران آگرہ سے ہوتے ہوئے آپ نے گولکنڈہ

میں قیام کیا،اور یہاں کے حاکم وقت شیخ محمد عبداللہ اوران کا وزیر شیخ محمد آپ کے مرید ہوگئے،دکن میں شیخ احمد کی وفات کے بعد،آپ نے دکن کو خیر باد کہہ دیا،اور آگرہ چلے گئے،اس وقت دہلی کو سلطنت بنالیا گیا تھا،آگرہ میں چندروز قیام کرنے کے بعد آپ مستقبل طور پر دہلی آگئے،دہلی میں خواجہ سید ابوالقاسم سبزواری کی صحبت حاصل ہوئی،خواجہ بزرگ نے آپ کی بہت دلجوئی کی،حضرت سرمد نے خواجہ سے کافی اکتساب فیض بھی کیا ہے،دہلی میں رہتے آپ نے چاہا،کہ بادشاہ وقت سے ملا جائے اور حقیقت حال سے آگاہ کیا جائے،ایک دن اچانک دربار شاہجہانی میں جا پہنچے،بادشاہ نے کہا، مجھے آپ کی روحانی کمالات کا علم تو ہیں،لیکن یہ برہنگی سمجھ میں نہیں آتی،سرمد نے جواب میں یہ شعر پڑھا ۔

بر سر برہنہ کرامات تہمت است

کشفی کہ ظاہر است ازو کشف محبت است

سرمد نے مدتوں سندھ کے ریگزاروں اور بیابانوں کی خاک چھانی اور مستی وجنوں کی حالت میں شمالی ہندوستان کے مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے،جب شاہجہان آباد پہنچے،جہاں ان کی ملاقات شہزادہ داراشکوہ سے ہوئی،سرمد اب ان کی صحبت میں رہنے لگا،آہستہ آہستہ شیخ سرمد کے کمالات کو دیکھ کر داراشکوہ آپ کے ارادتمندوں میں شامل ہوگیا،دارا شکوہ چونکہ ”با مسلمان اللہ اللہ با برھمن رام رام“ کے مصداق تھا،وہ ہر مذہب وملت کے بزرگوں سے یکساں عقیدت و احترام سے ملتا تھا،اس کے دربار میں ہندو یوگی بھی رہتے تھے،اور مسلمان درویش بھی،وہ جوگیوں اور سنیاسیوں کو عارف با اللہ مانتا تھا،صبح اٹھ کر سورج کو پانی بھی چڑھاتا تھا،انگشتری پر پربھو کا لفظ کندہ کرا کے پہنتا تھا،ماڈرن انڈین ہسٹری کے مصنف لکھتے ہیں کہ ”داراشکوہ کو تصوف کا شوق اور دیوانہ مزاج لوگوں سے لگاؤ تھا،وہ خود بھی ایک بڑا عالم تھا،اسے عربی، فارسی اور سنسکرت پر پوری مہارت حاصل تھی،انھوں نے ھندوں کی مقدس کتاب جیسے بھگوت گیتا،راماین اور ہندو اپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کرایا،داراشکوہ کو فلسفیانہ اور مذہبی امور میں بےحد دلچسپی تھی،آپ خود کئی کتابوں کے مصنف ہے،[۳]

سرمد نے حالات کی نزاکت کو مدنظر رکھ کر کچھ ہوش ربا کرامات کیں ہیں،ایک روایت میں یہ بھی مشہور ہے کہ چند یاران طریقت نے اصرار کر کے آپ کو مسجد میں لے جا کر نماز پڑھنے پر مجبور کیا،آپ کو صرف ایک کمبل اڑھا دیا گیا اور آپ جماعت میں شامل ہوگئے،لیکن دوسری ہی رکعت میں جماعت چھوڑ کر باہر بیٹھ گئے،لوگوں نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہے؟ تو آپ نے فی البدیہ یہ رباعی ارشاد فرمائی ۔

چنداں دل ناداں بہ غم سیم وزرست — گو وقت نماز بہ فکر دگرست

دروہم و خیال ایں و آں بیشترست — از فکر مال خود بی خبر است

(جب دل میں رجوع اللہ نہ ہو اور حضور قلب حاصل نہ ہو سکے تو یہ عبادت نہیں بلکہ عبادت کا مذاق ہے،اس

وقت امام کا دل اس فکر میں مبتلا ہے کہ کہیں سے کچھ رقم دستیاب ہو جائے تو اپنے جوان بیٹوں کی شادی کر دوں، ان سے کہہ دیجیے کہ یہاں ایک خزانہ موجود ہے، اس سے نکال لیں اور کام میں لائیں، چنانچہ جب وہاں پر مٹی کھود کر دیکھا گیا تو واقعی کثیر خزانہ ملا)

ایک اور روایت میں درج ہے، کہ جمعہ کے دن اورنگ زیب محل سے چل کر مسجد شاہجہانی میں نماز کے لئے جا رہے تھے، راستے میں حضرت سرمد کو بیٹھے ہوئے دیکھا، تو آپ نے ان کے پاس جا کر کہا، کہ آپ اس طرح شارع عام پر تو برہنہ نہ بیٹھا کریں، آپ کو دیکھ کر لوگوں کے وضو فاسد ہوتے ہیں، کم از کم یہ کمبل جو آپ کے پاس ہے اوڑھ لیا کریں، سرمد نے قہر آلودہ نظروں سے بادشاہ کی طرف دیکھا اور کہا ''لا تو ہی اوڑھ دے'' اورنگ زیب نے کمبل کا کونہ پکڑ کر اٹھانا چاہا، تو کمبل کے نیچے چند ایسے تازہ تازہ انسانی سر رکھے ہوئے تھے، جن سے خون رس رہا تھا، جن میں ان کے تینوں بھتیجوں اور ان کے ساتھیوں کے چہرے بھی شامل تھے، بادشاہ نے یہ دلخراش منظر دیکھا، تو لرز اٹھا، پکڑا ہوا کمبل ہاتھوں سے چھوٹ گیا تب آپ نے فرمایا کہ اب تو ہی بتلا کہ تیرے عیبوں کو چھپاؤں یا اپنی ستر کو چھپالوں۔

سرمد کی موت کے حوالے سے مختلف روایات ملتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ سرمد کلمہ کا صرف ایک جز یعنی ''لا الہ'' پڑھتا تھا، اس پر سرمد کو علماء وفضلاء کے مجمع میں طلب کیا گیا، کلمہ پڑھنے کے لئے کہا گیا، تو سرمد نے حسب عادت صرف ایک جز ہی پڑھا، اس پر علماء نے اعتراض کیا تو سرمد نے کہا، کہ میں صرف اتنا ہی سمجھتا ہوں، تو آگے کیسے پڑھوں؟ وقت کے علماء نے کہا کہ یہ کفر ہے، اگر سرمد توبہ نہ کریں تو واجب القتل ہے، بہر حال سرمد کے قتل کا فتویٰ جاری ہونے کے بعد ان کو قتل گاہ لے جایا گیا، جب جلاد تلوار لیکر آگے بڑھا، تو سرمد نے مسکرا کر نظر ملائی اور کہا ''فدائی تو شوم بیا بیا کہ تو بہر صورتی کہ می آئی من ترا خوب می شناسم'' صاحب مراۃ الخیال کا کہنا ہے، کہ اس جملہ کے بعد سرمد نے یہ شعر پڑھا اور مردانہ وار سر تلوار کے نیچے رکھ کر جان دیدی۔

شوری شد واز خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

ایک روایت یہ بھی ہے، کہ آپ کا سر مبارک جب تن سے جدا کیا گیا، تو آپ ایسے جلال میں آئے، کہ آپ نے اُسے دوڑ کر اٹھالیا اور ہتھیلی پر رکھے ہوئے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھتے چلے گئے، اور اُسی وقت آپ کے پیرومرشد سید ہرے بھرے شاہ کی آواز فضا میں گونج گئی، پوچھا! سرمد کہاں جا رہے ہو؟ عرض کیا دربار نبوت میں فریاد لے کر جا رہا ہوں، آپ نے فرمایا! کہ کیا کرتے ہو؟ تم اپنی منزل کو پا چکے ہو، ضبط سے کام لو، زندگی بھر تو تم نے لب نہ ہلائے، چنانچہ آپ اپنی حیات مبارک میں ہی کار انجام سوچ چکے تھے کہ شہادت ہی میرا مقام ہے۔

سر مد کہ ز عشق سرمدی یافت کربای عشق بی خودی یافت
ہشار نہ سگہ ز تیغ جلاد منزل بہ مقام احمدی یافت

اھل تصوف سرمد کو ولی سمجھتے ہے، کہتے ہیں کہ وہ غیبی اسرار سے واقف تھا، اس شعر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

سر جدا کرد از تنم شوخی کہ باما یار بود
قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

دوسری روایت کے مطابق سرمد نے داراشکوہ کے بادشاہ ہونے کی پیشن گوئی کی تھی، لیکن وہ شکست کھا کر قتل کر دیا گیا، تو اورنگ زیب نے دریافت کیا، کہ داراشکوہ کے بادشاہ بننے کی بات کیوں کر سچ نہ نکلی، حضرت سرمد نے کہا! کہ میری پیشن گوئی بلکل درست نکلی، کیونکہ داراشکوہ کو ابدی سلطنت مل گئی، یہ بات اورنگ زیب کو کافی ناگوار گزری، بقول صاحب تذکرہ مراۃ الخیال سرمد پر اور بھی الزامات تھے، جیسے کہ وہ برہنہ رہا کرتا تھا جو شریعت کے خلاف ہے[۴] چنانچہ قاضی الوقت عبدالقوی نے ان سے باز پرس کی تو انھوں نے یہ رباعی پڑھی۔

خوش بالائی کردہ چنین پست مرا چشمی بدوجام بردہ ازدست مرا
او در بغل من است ومن است در طلبش دزدی عجبی برہنہ کردست مرا

کہا جاتا ہے، کہ سرمد پیغمبر اکرم ﷺ کے معراج جسمانی کا منکر تھا اور درج ذیل رباعی پر اسے کفر کا فتویٰ صادر ہوا۔

آنکس کہ سر حقیقتش باور شد خود پہن تراز پہر پہناورشد
ملا گوید کہ بر فلك شد احمد سرمد گوید فلك بہ احمدُر شد

غرض آپ نے توبہ نہ کی، اور نہ ہی برہنگی کی روش کو ترک کیا، آپ کو واجب القتل قرار دیدیا گیا، ان کے قتل کا واقعہ ۱۸ ربیع الثانی ۱۰۷۰ھ میں پیش آیا۔

عمر ایست کہ آوازئہ منصور کہن شد
من از سر تو جلوہ دہم دار و رسن را ۵۔

جامع مسجد کے قریب حضرت سرمد کی قبر اب بھی مرجع خواص وعام ہے، والہ داغستانی کے بقول "در جنت مسجد جامع گردن اوراز دندودرھا نجادفن گردند" لوح مزار پر یہ کتبہ بخط جلی نستعلیق نصب ہے۔

شاہ سرمد در عہد عالمگیر چو سفر ساختہ بہ خلد برین
گفت تاریخ اکبر مسکین لحد مرقد شہید سرمد این

(۱۸ماہ ربیع الآخر ۱۰۷۰ہجری مطابق ۶۰/ ۱۶۵۹عیسوی)

جائے مزار پر آپ کا مشہور مبارک بھی ہے، شاہجہانی مسجد کے زیریں مشرقی دروازے کے مقابل شارع عام پر واقع یہ انوار و برکات اور تجلیات ربی کا مرکز بنا ہوا ہے۔[۶]

حضرت سرمد کا عرس آپ کی تاریخ وصال ۱۸ ربیع الآخر کو ہوتا ہے، آپ قادریہ سلسلہ کے بزرگ ہے اور حضرت ابولقاسم سبزواری سے بھی شرف خلافت چشتیہ نظامیہ میں حاصل کر چکے ہے۔

حضرت شیخ سرمد تصوف کے اعلیٰ مقام پر فایز ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم شاعر ہے، آپ نے زیادہ تر کلام رباعیات اور قطعات میں کہا ہیں، آپ کی رباعیات رندانہ مضامین اور دنیا کی بے ثباتی پر کہی گئی ہیں، جن میں آپ اکثر فلسفیانہ مضامین باندھتے ہیں، سرمد کے ہاں عشقیہ، فخریہ اور فلفیانہ غرض ہر طرح کے مضامین ملتے ہیں، جن میں ان کی شاعرانہ شخصیت پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، اس کی شوخی استعارات اور تشبیہات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے، اگر چہ سرمد کی رباعیات میں وہ شیرینی، تاثیر اور سلاست نہیں ہیں، جو کہ عمر خیام کے یہاں ملتی ہیں، لیکن پھر بھی اکثر دونوں کے خیالات ملتے جلتے ہیں جیسے سرمد کو غم عشق راس آتا ہے اور عاشق کی اچھی غذا شراب کو ہی تصور کرتا ہے، اسے شراب پینے کی تاکید کرتا ہے، تاکہ شراب ہی اس کے وصال یار کا ایک وسیلہ بن سکے۔

سرمد بقمار عشق بازی نبرند   تا سر نہ دہی بسر فرازی نبرند
می خور می خور اگر خدا خواہی   ناکردہ گناہ پیش قاضی نبرند

سرمد آج کے لالچی دنیا میں رہنے والے نوجوان کو تنبیہ کرتا ہے، کہ یہ جو تو ان حسین چہروں سے پیار کرتا ہے، ان کے حسن و جمال کا شیدائی ہے، یہ محض ایک دھوکہ ہے، کیونکہ ان کو تو زر و مال اور جواہرات سے پیار ہے، اور تمہاری خالص محبت ان کے کسی کام کی نہیں، اس لیے ان سے کنارہ کرلیں، ان پر اپنی زندگی برباد نہ کر، بلکہ اپنے پروردگار سے محبت کر اور کامیاب ہو جا۔

از ماہ رخاں اگر نگیری تو کنار   لذت نہ بری بیشتر ازبوس و کنار
ایں سیم بران شفتہ سیم و زراند   نقد دل و جاں مدست ایشاں مسپار

سرمد عام صوفی شعراء کی طرح ریاکار زاہدوں کی دھجیاں اُڑاتا ہے، ان کی نماز، روزہ، تسبیح اور شب بیداری کو ناقص قرار دیتا ہے۔

ای زاہد بی چارہ نیازت ناقص   این روزہ و تسبیح و نمازت ناقص
تا لوث ریا پاک نسازی از خود   این طاعت شبہای درازت ناقص

اے انسان اس ناپیدار دنیا اور دنیا پرستوں سے زیادہ میل جول نہ رکھ، اس میں تمہارا نقصان ہے، اس میں رنج و الم ہے، میں تم کو کہتا ہوں کہ دنیا اور دنیا کے لوگوں سے کنارہ کش ہو جا اس میں ہی تمہاری بہتری ہے ۔

چیزی کہ در عیب بود نیست آمیزش خلق است بگیرش کمتر
بسیاری اختلاط مردم رنج است گفتم بتو ہر چند کہ کمتر بہتر

سرمد بارگاہ خدا میں حاضر ہو کر اپنے گناہوں اور خطاؤں کی معافی چاہتا ہے، سرمد کہتا ہے، کہ مجھے اعتراف ہے کہ میں خطا کار ہوں، مجھے اپنے جرم پر انتہائی شرمندگی ہے، مجھے اپنے زاہد اور متقی ہونے پر کوئی ناز نہیں ہے ۔

تا چند کنم گناہ یارب ہر دم ازفضل تووز کردہ خود منفعلم
آیا چہ کند نہ متقی آخر کار بسیاری جرم وبی حیائی کردم

سرمد فرماتے ہے! کہ اے انسان تو حرص و ہوس کو چھوڑ کر یادالٰہی میں مصروف ہو جا، تاریکی اور غفلت سے نکل آ، وقت تمہارا انتظار نہیں کرتا، جوانی کے دن چلے گئے اور اب بوڑھاپا آچکا ہے، ان ایام کو برباد نہ کر، بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بزرگی اور فیض حاصل کر لے ۔

ھر روز بدو یائی ہوس گردابی ازظلمت غفلت ہمہ شب درخوابی
ایام جوانی شد و پیری آمد وقت است اگر فیض چمن دریابی

میں نے خود کو ہم مثل آئینہ بنالیا، جس طرح آئینہ میں ہر اچھائی اور برائی نظر آجاتی ہے، اور آئینہ ساکت و خاموش رہتا ہے، اسی طرح میری نظر بھی دنیا کی سیر کرتی ہے، یعنی گوشہ نشین ہو کر بھی میں ساری دنیا کی خبر رکھتا ہوں، یہ سب خاموشی کے سبب ہیں ۔

در گوشہ فکر سیر دنیا کردم از بہر خود آرام مہیا کردم
ہر نیک و بدی کہ بند از جا رود ایں وضع ز آئینہ تماشا کردم

سرمد محبوب کو مجازی لباس اور مجازی رنگ وروپ میں دیکھنے کا بڑا خواہش مند ہے، محبوب کی ہستی کو کوئی نہیں دیکھ سکا مگر سرمد اپنے محبوب کو عیاں اور آشکار دیکھنے کا بہت آرزومند ہے ۔

ای جلوہ گر نہاں عیاں شوبدرا در فکر بجتیم کہ ھستی تو کجا
خواھم کہ در آغوش کنارت گیرم تا چند تو در پردہ نمائی خود را

یہ میں نے بھی عجیب طرفہ مزاج پایا، کہ کبھی خود کو زاہد خشک ظاہر کرتا ہوں اور کبھی سراپا گناہگار، لیکن یہ میرا مزاج اپنا بنایا ہوا نہیں، بلکہ ان گل رخان دہر کے احسانات ہیں، کہ جو مجھے اس دو رنگی روش پر لا کر کھڑا کر دیتے ہیں، اور عمر رفتہ

ہوتے ہوئے بھی گناہ کی جانب مائل ہوجاتا ہوں ۔

چو پیر شدم گناہ گردید جواں   بہ شگفتہ گل داغ بہ ہنگام خراں
ایں لالہ رخساں نقل مزاحم کردند   گہہ متقیم گاہ سرا پا عصیاں

سرمد میں عاشق حق ہونے کے آثار نمایاں ہیں ۔

سرمد کہ ز جام عشق مستش کردند   بالا بردند و باز پستش کردند
میخواست خدا پرستی و ہشیاری   مستش کردند دمی پرستش کردند

دنیاوی محبوب اوراس کے وصل ناپائیدار سے اپنے آپ کودور رہنے کی تاکید کرتا ہے ۔

باز آ باز آ فکر باطل باز آ   از وہم و خیال خام ای دل باز آ
خوشنود مشو ز فکر دنیا ہر گز   نی وصل بماند ونہ اصل باز آ

ماخذات:

۱ مصنف مراۃ الخیال کا بیان ہے کہ ''اصلش از فرنگستان وارمنی بود'' حالانکہ والہ داغستانی کہتے ہے کہ ان کا وطن کاشان تھا۔

۲ اگرچہ بعض تذکرہ نویسوں نے سرمد کا اسلامی نام ''محمد سعید'' لکھا ہے، لیکن محمد حسین آزاد اور بعض دیگر مصنفین کے بقول سرمد کا نام معلوم نہیں ہے، بعض تذکروں میں سعیدای سرمد نام درج ہے۔

۳ مثلاً سفینۃ الاولیا، سکینۃ الاولیا، مجمع البحرین، نادر النکات، حسنات العارفین اور رسالہ حق نما۔

۴ عالم گیر نے ایک مرتبہ سرمد کو بلا کر کہا کہ ''تم ننگے کیوں پھرتے ہو؟ آپ نے فی البدیہ یہ رباعی پیش کی ۔

آن کس کہ ترا سریر سلطانی داد   مارا ہمہ اسباب پریشانی داد
پوشاند لباس ہر کہ را عیبی دید   بی عیباں را لباس عریانی داد

۵ یہ شعر کہی تذکروں میں اس طرح درج ہے ۔

دیراست کہ افسانہ منصور کہن شد   اکنون سرنو جلوہ دہم دار ورسن را (نگارستان فارس، ص۱۹۹)

۶ ''واقعات دار الحکومت دہلی، حصہ دوم، ص۱۱۴'' میں درج ہے، کہ جامع مسجد کے شرقی دروازے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر کر کسی قدر جانب شمال لب سڑک، نیم کے درخت کے نیچے صوفی سرمد کی قبر سرخ رنگ کے کٹہرے کے اندر ہے، اوران کے سرہانے سبز رنگ کے چوبی کٹہرے میں شاہ ہرے بھرے کا مزار ایک چبوترے پر ہے، جس پر ایک پختہ طاق چراغاں کے لئے بنا ہوا ہے، ان دونوں مزاروں کے بیچ میں ایک نیم کا درخت حد فاصلہ ہے نصف شمالی حصے میں ہرے بھرے شاہ کی قبر ہے، جوصوفی سرمد کے پیرو مرشد تھے۔

کتابیات:

۱ تذکرہ طاہر نصیر آبادی

۲ تذکرہ مراۃ الخیال

۳ حسنات العارفین بحوالہ معارف

۴ شعر فارسی در ھند و پاکستان از مظفر حسین شمیم

۵ عالمگیر

۶ ماڈرن اینڈین ہسٹری از سری رام شا،ص ۱۱۵

۷ ماڈرن اینڈین ہسٹری از سرکار اور دتا،ص ۴

۸ معارف نمبر ۶

۹ نگارستان فارس از محمد حسین آزاد

۱۰ واقعات دار الحکومت دہلی،حصہ دوم،ص ۱۱۴

☆☆☆

محمد شہباز
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
دہلی یونیورسٹی، دہلی

حکیم حاذق گیلانی کے کلام میں جمالیاتی عناصر

ہندوستان کے فارسی ادب کی تاریخ میں عہد شاہجہانی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے جو دوسرے سلاطین کے دور میں بہت کم ملتی ہے۔اس دور نے فارسی غزل گوئی کو ہندوسان میں عروج و کمال بخشا۔جن میں ابو طالب کلیم، طالب آملی، قدسی مشہدی، میر الہی ہمدانی، ملا شیدا اور حکیم حاذق گیلانی جیسے شعرا قابل ذکر ہیں۔

حکیم حاذق گیلانی ۹۹۲ھ فتح پور سیکری میں پیدا ہوئے جیسا کہ خود آپ نے اپنے جائے تولد کو ایک شعر میں بیان کیا ہے۔

سخن برای من است و من برای سخن
درین سخن، سخنی نیست تا سخن دانیست
اگرچه مولد من هست فتحپور ولیك
روانی دل من پر ز علم یونانیست

(دیوان حاذق، ص۱۰۲)

آپ کا نام کمال الدین بن نجیب الدین ہمام بن عبد الرزاق گیلانی اور تخلص حاذق تھا۔(گیلان نامہ، ص ۲۴۸)۔آپ کے والد گرامی نجیب الدین ہمام گیلانی ایک مشہور حکیم تھے اور حاذق کے بچپن میں ہی دارِ فانی سے کوچ کر گئے تھے۔والد بزرگوار جلال الدین اکبر کے دور حکومت میں داروغہ مطبخ (بکاول بیگی) کے منصب پر فائز تھے۔خط شناسی اور شعر فہمی میں بے نظیر اور یگانہ تھے۔حکیم ہمام فن طبابت میں اس قدر ماہر تھے کہ ایک بار بادشاہ جہانگیر زیادہ شراب نوشی کی وجہ سے بیہوش ہوگیا۔بس حکیم ہمام کو بلایا گیا، حکیم ہمام نے بادشاہ کی حالت کو دیکھ کر کہا:

”صاحب عالم بدیں روش که شما عرق نوش جان می کنید نعوذ بالله شش ماه دیگر کار به آنجا رسید که علاج پذیر نباشد“۔

(مجالس جہانگیری، تعلیقات ص ۳۱۵)۔

حکیم ہمام کی بات کا اثر بادشاہ پر اس قدر طاری ہوا کہ اس نے اپنی شراب نوشی کی مقدار کم کردی۔

حاذق گیلانی کی تربیت و پرورش والدہ کی نگرانی میں ہوئی۔آپ کو فنِ طبابت وراثت میں ملی تھی۔مورخین نے لکھا ہے کہ حکیم حاذق کے دادا حکیم عبدالرزاق گیلانی اوران کے تاؤ حکیم ابوالفتح گیلانی، والد حکیم ہمام گیلانی، چچا حکیم لطف اللہ گیلانی اور بیٹے حکیم خوشحال گیلانی،سب کے سب حکیم تھے۔

حکیم حاذق کا خاندان نہ صرف گیلان میں ممتاز تھا بلکہ ہندوستانی سلاطین کے دربار میں بھی آپ کے خاندان کے لوگ اعلیٰ منصبوں پر فائز تھے۔

حکیم حاذق گیلانی اپنی ہنرمندی اور دانش مندی کی بنیاد پر جہانگیر اور شاہجہاں کے دربار میں ایک اہم مقام رکھتے تھے۔بادشاہ جہانگیر نے حکیم حاذق گیلانی کو شہزادہ پرویز کی ملازمت میں بھیجا۔شہزادہ سے حکیم کی قربت اس قدر بڑھ گئی کہ لوگ حسد کرنے لگے۔حکیم اس کینہ جوئی کو سمجھ گئے اور اپنے ایک شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا۔

شد دشمن تو کمال بسیار
چون بر رخ خوب خال بسیار

(دیوان حاذق،ص۳۰۳)

شہزادہ پرویز کی وفات کے بعد حکیم حاذق گیلانی دربار شاہجہانی سے منسلک ہوگئے اور اپنی صلاحیت واستعداد کا کمال دکھایا۔ملا عبدالحمید لاہوری نے اپنی کتاب ''بادشاہ نامہ'' میں لکھا ہے کہ شاہجہاں نے آپ کو ''حکمت ماب'' ''نتیجہ الاماجدوالاعالی'' اور لائق العنایات السلطنہ'' جیسے خطابات سے نوازا تھا۔

شاہجہاں نے حاذق کے علم وفن اور مہارت کو دیکھتے ہوئے سفیر بنا کر امام قلی کے پاس بھیجا تھا۔اس خدمت کو انجام دینے کے بعد حاذق گیلانی کو سہ ہزاری اور عرض مکرر کے منصب پر فائز کیا گیا تھا۔اس کے علاوہ شاہی طبیب کا منصب بھی آپ کو عطا کیا گیا۔

بندرا بن داس نے اپنی کتاب ''سفینہ خوشگو'' میں حکیم حاذق گیلانی کی زندگی سے متعلق ایک قصہ بیان کیا ہے جو کہ لطافت اور حلاوت سے بھرپور ہے،وہ اس طرح ہے:

> "حضرت مرزا بیدل فرموده اند که شید ا وقتی پیش حکیم حاذق رفته بود، حکیم دیوان اشعار خود پیش او گذاشت -این یك دو صفحه خوانده ،بر همزد -حکیم پر سید چیزی انتخاب کردید؟اودر جواب گفت -بلی، جلد این کتاب از منتخبات است-حکیم غضباك شده

،فرمود: تادر حوض آبش غوطه دادند ۔چون ازان جا خلاص شد ،به حضوری عالی حضرت شاہی رسید و ماجره بعرض رسانید ۔بادشاہ به حکیم فرمود ،شمابی حرمتی آن شاعربی چاره چرا کردید؟حکیم معروض داشت که من شعر نمی گویم آنچه گفته ام ،تفسیر آیات و معنی احادیث است و این چنین کلام را بخاطر نیا ورد ۔پادشاہ را وقت خوش شد''۔(سفینہ خوشگو،دفتر دوم،ص۳۳۱)

حکیم حاذق گیلانی ذہین،ہوشیار،پرہیزگار اور دیندار انسان تھے۔ان کی شاعری حمد وثنا اور نعت ومنقبت سے بھری پڑی ہے۔لیکن ان سب کے باوجود نہایت بد اخلاق اور تند مزاج انسان تھے۔مآثر الامرا کے مولف نے لکھا ہے:

" حکیم بسیار تند مزاج با رعونت و تکبر بود،از خویشتن بینی بر خود فلطی طرفه پندار داشت''

حکیم حاذق کے بارے میں بزم تیموریہ میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے لکھا ہے:

''اپنی خود بینی کی بنا پر اپنے کو انوری سے بہتر تصور کرتا تھا۔اپنے دیوان کو بڑی زینت وآرائش کے ساتھ لکھوا کر مرصع طشت پر رکھتا تھا اور جب کسی مجلس میں جاتا اور عمائدین سلطنت اس کی تعظیم کے لیے نہ اٹھتے تو برہمی کا اظہار کرتا،دیوان کو ایک مطلا رحل پر رکھ کر کلام سناتا تھا''۔

سفارت کی خدمت انجام دینے کے بعد حازق گیلانی واپسی میں جب کابل آئے تو میر الٰہی ہمدانی حکیم حاذق سے ملنے کے لئے گیا۔حاذق گیلانی میر الٰہی ہمدانی کے ساتھ بد اخلاقی سے پیش آیا۔میر الٰہی ہمدانی ناراض ہوگیا اور یہ رباعی لکھی:

دایم ز ادب سنگ و سبو نتوان شد
در دیده اختلاط مو نتوان شد
صحبت به حکیم حاذق از حکمت نیست
با لشکر خبط روبرو نتوان شد

افضل سرخوش نے اپنی کتاب''کلمات الشعراء''میں لکھا ہے کہ ایک دن حکیم حاذق نے ملاشیدا کے سامنے یہ مطلع پڑھا:

بلبل از گل بگذرد ، گر درچمن بیند مرا
بت پرستی کی کند ، گر برہمن بیند مرا

ملاشیدا نے کہا آپ نے یہ شعر عالم امردی میں کہا ہوگا۔حکیم حاذق غضبناک ہوگئے اور ملاشیدا کو اپنی حوض میں ڈالنے کا حکم دیا۔عبدالباقی نہاوندی نے اپنی کتاب ''ماثر رحیمی''میں حاذق کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''در طرز سخن سنجی و نکته پردازی نیز طبیعت کافی و سلیقه وافی دارد ...لغات مشکله و الفاظ دقیقه دراشعار آبدار خود که دست تصرف اوهام اهل زماں از فهمیدن آن قاصر است،بکارمی برد''

اس کے باوجود حکیم حاذق کے اشعار لطیف اور عالی ہیں اور حلاوت شیرنی سے خالی نہیں۔

آپ نے ایک دیوان اور سات مثنویاں یاد گار کے طور پر چھوڑی ہیں۔آپ کے دیوان میں قصاید،غزلیات،قطعات،رباعیات اور ترجیع بند جو تقریباً دس ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔آپ کی مثنویات کے نام اس طرح ہیں:(۱) گنج طلسم)(۲) تجلی طور(۳)ظل الشمسین (۴) بہار خلد(۵) تمسک نجات(۶) ساقی نامہ اول (۷) ساقی نامہ دوم۔

حکیم حاذق نے آخری زمانہ میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور اس زمانہ میں شاہی خزانہ سے بیس ہزار اور بعد میں چالیس ہزار روپیہ سالانہ ملتا تھا ۱۰۶۸ھ فتح پور سیکری میں وفات پائی اور وہیں تدفین ہوئی۔(نتیجہ الافکار ص ۱۹۱)۔

جمالیاتی عناصر:

جمالیات ایک ایسی اصطلاح ہے جس کی تعریف و توضیح کرنا انتہائی مشکل کام ہے کیونکہ اس میں اتنی جہتیں ہیں جن کو کھولنے اور ان پر روشنی ڈالنے کا کام کبھی ختم ہی نہیں ہوسکتا۔بقول ڈاکٹر شکیل الرحمٰن جمالیات کی تعریف اور تشریح کا کام ابھی جاری ہے اور اس کی معنویت پھیلتی جارہی ہے۔قاضی عبدالستار نے اپنی کتاب بنام ''جمالیات اور ہندوستانی جمالیات''میں جمال کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

پہلی۔وہ جمال جس کا ادراک حواس خمسہ کے ذریعے ہوتا ہے

دوسری۔وہ جمال جو مظہر جمال کی ہیئت،تعمیر یا ترتیب سے ٹپکتا ہے۔

تیسری۔وہ جمال جو حسن ابلاغ یا حسن اظہار کا احاطہ کرتا ہے۔

حکیم حاذق گیلانی کی شاعری میں یہ تینوں اقسام بدرجہ اتم موجود ہیں اور اس کے نمونے حاذق کے کلام میں جا بجا ملتے ہیں۔جیسا کہ انھوں نے اپنی مثنوی بنام ''تجلی طور''میں سرکار دوعالم ﷺ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

زلف او سحر و بوی او معجز
شب و روزم از وصف او عاجز
شرفش ہست بہ ہمہ اقران
کہ برو پای می نہد قران

مذکورہ بالاشعر میں وہ جمال بھی ہے جومظہر جمال کی ہیئت سے ٹپکتا ہے(زلف اوسحر)اور وہ جمال بھی ہے جس کا ادراک حواس خمسہ کے ذریعے ہوتا ہے(بوی اومعجز)اور وہ جمال بھی ہے جوحسن ابلاغ یاحسن اظہار کا احاطہ کرتا ہے(شب وروزم از وصف اوعاجز)۔

حاذق گیلانی نے اپنے اس شعر میں ظاہری،معنوی اورحسی تینوں جمال کو بیان کیا ہے۔

حاذق کی شاعری حسن و جمال،عشق ومحبت،معانی کی لطافت،خیالات کی بلندی،الفاظ وترکیب کی بندش اور حسن اظہار کی ایک بہترین مثال ہے۔آنے والے اشعار میں حاذق گیلانی نے اپنے محبوب کے جمال کو کس اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے،ملاحظ فرمائیں:

خم می با لبش از جوش رفتہ
بچشمش ہر کہ دید از ہوش رفتہ
چوبر کتفم نہادی دوش دستی
فلك با دوش من ہم دوش رفتہ

کس خوبصورتی کے ساتھ حاذق گیلانی نے ان دواشعار میں اپنے محبوب کے جمال کو بیان کیا ہے کہتے ہیں کہ میرے محبوب کے لب اتنے حسین ہیں کہ شراب بھی جب ان سے لگتی ہے تو اس کا جوش ختم ہوجاتا ہے۔اور میرے محبوب کی نگاہیں ایسی ہیں کہ جوبھی دیکھتا ہے اس کے ہوش ہی اڑ جاتے ہیں۔دوسرے شعر میں حاذق گیلانی نے محسنات معنویہ کی ایک بہت مشہور صنعت مبالغہ کو بیان کیا ہے جوحسن اظہار کی عمدہ مثال بن سکتی ہے۔حاذق کہتے ہیں کہ میرے محبوب نے جب میرے کاندھے پر اپنی ہتھیلی رکھی تو آسمان نے اپنا کاندھا میرے کاندھے سے ملالیا۔

حکیم حاذق گیلانی نے خود اپنے حسن و جمال اور جوہر کمال کی تعریف بھی کی ہے۔جیسا کہ ان کی عادت تھی کہ دوسروں کی تعریف کے ساتھ ساتھ اپنی بھی تعریف کرتے تھے۔شاہجہانی دربار کے شعرا میں ان کی رعونت اور خود پسندی مشہور تھی۔بزم تیموریہ کے مولف نے لکھا ہے کہ اپنی خود بینی کی بنا پر حکیم حاذق خودکوانوری سے بہتر سمجھتا تھا۔جیسا کہ درج ذیل اشعار معلوم ہوتا ہے:

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا
بت پرستی کی کند گر برهمن بیند مرا
در سخن پنہاں شدم مانند بودر بر گل
میل دیدن ہر کر دارد سخن بیند مرا
حسن چو در بحر افتدموجش بساحل می برد
آنکہ در غربت کند کم در وطن بیند مرا

اس شعر میں محسنات لفظیہ کی مشہور صنعت مراعات النظیر پائی جاتی ہے۔یعنی ایسے الفاظ استعمال کرنا جن کے معانی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں جیسے شعر کے پہلے مصرع میں بلبل،گل اور چمن اور دوسرے مصرع میں بت پرستی اور برھمن ہیں۔دوسرا اور تیسرا شعر بھی جمالیاتی عناصر سے مالا مال اور حسن ابلاغ کا بہترین نمونہ ہے۔

جمال وخوبصورتی کو محسوس کرنے کا ہر انسان کا معیار اور پیمانہ الگ ہوتا ہے۔کسی کو پھول کی خوشبو زیادہ متاثر کرتی ہے کسی کو رنگ،کوئی پھول کی پنکھڑی کی نرمی سے،تو کوئی پھول کے اچھوتے پن سے لطف اندوز ہوتا ہے۔دیکھنے والے کی نظر کے زاویے اس کی جمالیات کے الگ الگ پہلو بن جاتے ہیں۔اسی طرح شعروادب میں بھی فصاحت و بلاغت،سلاست وروانی،حسن الفاظ ومعانی اور اسلوب کی جدت وندرت سب کے سب جمالیات کے زمرہ میں شمار ہوتے ہیں۔حاذق کے مندرجہ ذیل اشعار میں یہ خوبیاں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

مستان شوم مستان شوم مستان تر از مستان شوم
اندر جمال مست ساقی بنگرم حیران شوم
جان کجا پوشد قبا،عمامہ کی بندد بسر
من هم لباس بی لباس پوشم و عریان شوم
یار ما آمد بسوئی بوستان از بہر دید
نرگس و گل یاسمین و سنبل و ریحان شوم

(انتخاب دیوان حاذق،ص۲۳)

نہ خبر ز راز دارم،نہ خبر ز رازداران
من مست را چہ پرسی ز کلام هوشیاران

بفراخ چرخ توسن شده ام سوار اش آن رو
که پیاده در رکابست نروند خر سواران
چو تو پرده بر نگیری چه شب وچه روز روشن
چو تو در چمن نیایی چه خزان وچه بهاران

(گیلانیان دردیارھند،ص۱۹۸)

بالآخر حاذق گیلانی نے اپنے کلام میں مدح وثنا، پند ونصیحت، رند ومستی، مے ومیخانہ، عشق ومحبت، بے ثباتی دنیا اور عقبی وآخرت کو بیان کیا ہے جن میں جمالیات کے مختلف عناصر کی بہترین عکاسی نظر آتی ہے۔

مراجع:

۱۔دیوان حکیم حاذق گیلانی، رام پور رضا لائبریری، رام پور۔
۲۔انتخاب حکیم حاذق گیلانی، سبحان اللہ فارسیہ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
۳۔ہفت مثنویات حکیم حاذق گیلانی، یونیورسٹی فارسیہ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
۴۔ماثر رحیمی، جلد سوم، ملا عبدالباقی نہاوندی، انجمنِ آثار ومفاخرِ فرہنگی، تہران۔
۵۔گیلانیان دردیارھند، سید عباس آزمودہ، نشر بلور، رشت، ایران۔
۶۔سفینہ خوشگو، بندرا بن داس، موزہ ومرکز اسناد مجلس شورای اسلامی، تہران۔
۷۔بزم تیموریہ، جلد دوم، سید صباح الدین عبدالرحمن، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔
۸۔جمالیات اور ہندوستانی جمالیات، قاضی عبدالستار، ادبی پبلیکیشنز آنند بھون، علی گڑھ۔
۹۔غالب کی جمالیات، ڈاکٹر شکیل الرحمن، عصمت پبلیکیشنز، سری نگر، کشمیر۔

☆☆☆

صائمہ احمد
ریسرچ اسکالر،شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

جلال الدین خلجی کے نظریات و مذہبی رجحانات

عہد مملوکیہ کے بعد ہندوستان پر اپنی حکمرانی کا پرچم لہرانی والی خلجی حکومت تھی۔کقباد کے مفلوج ہوجانے کے بعد امراء واعاون سلطنت مس ک اقتدار کی کشمکش تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔کچھ مدت تک امراء وخلجوکس کے مابین ہنگامہ آرائی جاری رہی۔660ھ بالآخر خلجوں کو فتح وکامرانی حاصل ہوئی۔انہوں نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ آزاد حکمرانوں کو زیر کیا۔ان کے بدولت ملک کے دور دراز گوشوں میں مسلم فوجیں دست بردار ہوئی۔دوسری طرف غیر ملکی مملکوش کے خلافِ دفاع پر کڑی نظر رکھی۔اگر علاوالدین اور جلال الدین نے بروقت سخت اقدامات نہ کئے ہوتے۔تو ہندوستان منگولوں کے شکنجہ میں پھس گیا ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ جلال الدین اور علاوالدین کے اصطلاحات عہد وسطی میں انوکھے تجربات کی حیثیت رکھتی ہے۔ہندوستان کے مسلم دور کی تاریخ کے صفحات میں خلجی کی جو چیز غیر معمولی اہمیت کے حامل ہے۔وہ انکی بےنظیر فتوحات کا متواتر سلسلہ ہے۔انہیں کوشش وکاوشوں سے ہندوستان جیسی وسیع سرزمین پر اپنا تصرف جمانے میں کامیاب ہوئی۔

خلجی انقلاب دوررس نتائج کا حامل تھا۔اس نے نہ صرف ایک نئے خاندان کی منادی کی۔بلکہ مسلسل فتوحات اورانتظام وانصرام حکومت میں بے مثال تجربات اور لاثانی تعلیمی وتہذیبی،معاشی،سیاسی سرگرمیوں کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔خلجی کی رگوں میں شاہی خون کی روانی نہیں تھی۔بلکہ انکا تعلق عوامی جماعت سے تھا۔انکی تخت نشینی نے اس ظاہری عقیدہ پر ضرب کاری لگادی تھی۔کہ اقتدار اعلیٰ صرف چیدہ وچنیدہ خاندانوں کی اجارہ داری ہے۔خلجی بغاوت بنیادی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے ترک اقتدار کے خلاف بغاوت تھی۔یہ دہلی کو مرکز ماننے والے لوگوں کے خلاف بغاوت تھی۔جوغور وغزنہ سے کسب فیض کرنا چاہتے تھے۔

بالآخر اس انقلاب کا یہ نتیجہ ہوا کہ عوام کی حکومت کو شاہی خاندان کی حکومت پر برتری حاصل ہوئی۔اس نے اعلیٰ حیثیت کا غرہ رکھنے والیکو پست کردیا۔جو دوسرے مسلمانوں،ہندوزاد،یاغیر ہندوستانی نیچی ذات کواپنے سے کمتر سمجھتے تھے۔ہندوستانی عوام کے لیے شاہی خاندان کی ایک خاندان سیدوسرے خاندان میں حکومت واقتدار کی منتقلی کوئی خاص

اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

سلطان جلال الدین خلجی:

جلال الدین 689ھ میں شاہی مسند پر برسر اقتدار ہوا، اور فیروز شاہ کا لقب اختیار کیا۔ یہ پیدائشی سے ایک سپاہی، تجربہ کار، بہادر و طاقتور انسان تھا۔ تجربہ کار انسان اسلئے تھا کیونکہ شمالی مغربی سرحد پر منگولوں سے عرصہ دراز تک جدوجدل رہا ہے۔ جلال الدین کی صلاحیت و کارکردگی ان منگولوں سے کہی حدتک بڑھی ہوئی تھی۔ کیونکہ اسکو تخت شاہی نہ توورثہ میں، نہ انتخاب کی بنیاد پر، نہ کسی سازش کے نتیجہ میں حاصل ہوا تھا۔ بلکہ ایک شخصی انقلاب کے نتیجہ میں تخت سلطنت ترکوں سے خلجیوں کی طرف منتقل ہوگیا۔ انکی متواتر حکومت محض طاقت وقوت، فہم وزکاوت کی وجہ سے رہی ہے۔ نہ کہ عوام کی تائید، نہ امرا ء کے مدد وتعاون، نہ ہی امراء وعلماء کی اعانت طلب کی۔ انھوں نے یہ ثابت کر دکھادیا۔ کہ مملکت مذہبی تعاون وامراء کے بغیر نہ صرف وجود میں آسکتی ہے۔ بلکہ موئثر طور سے اسکا انتظام وانصرام چلایا جاسکتا ہے۔

دوسری طرف اگر مذہبی وسیاسی نقطہ ہائے نظر سے دیکھا جائے۔ جلال الدین ہندوستان کے حکمرانوں میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے خود کو ہمیشہ جمہور کا ایک فرد سمجھا ہے۔ اسکی زندگی کا سیدھا سادا اصول فلاح عام (humanity) تھا۔ جس پر وہ ایمان رکھتا تھا۔ مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرتا لیکن اسکو کبھی تماشہ نہ بنناد یام۔ سلطنت پر فائز ہونے کے بعد جلالا الدین خلجی کی نیک ذاتی، بھلائی، خداترسی، خداشناسی، برداشت، حیا وعدل وانصاف کا شہرہ عام ہوگیا۔ اسکی رعایاپروری نے سب کو خوش کردیا ہر ایک کو حسب مطابق جاگیریں ملی، تنخوائیں مقرر ہوئیں، امیر خسرو کو دبیری کے عہدے پر فائز کیا۔ جب غیاث الدین کے بھتیجے گورنر کٹرہ ملک چھجو کشل خان پر فتح حاصل کی تھی۔ تو اسکے ساتھ کے لوگوں کو جب قیدی بنا کر لایا گیا۔ تو سلطان نے ملک چھجو اور اسکے قصور کو معاف کرتے ہوئے خلعت پہنا کر بھیج دیا۔ اسکی حکمت عملی بلبن اور التتمش سے مختلف رہی ہے۔ ضیاء الدین برنیتاریخ فیروزشاہی میں رقمطراز ہیں کہ:۔

> "اعوان و انصار جلالی با قوت و شوکت شدند و مکارم اخلاق و عدل و احسان و دینداری سلطان جلال الدین شہریان را روشن شد و تنفر و انفت کلی از میان خاتمت---"(ص نمبر 176)

اسکے علاوہ اس کے عہد حکومت میں رعایا مذہب کے محافظ اور دوسرے بادشاہوں کے زمانے سے کہیں زیادہ خوش تھے۔

مذہبی رجحانات:

جلال الدین کے مذہبی افکار وعقاید کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ذہنی انفجار وانداز فکر کا جائزہ لیا

جائے۔جس میں انکے اعتقاد کے نونہاد نے پرورش پائی تھی۔ان حالات کو سمجھا جائے جس کے عمل اور ردعمل نے انکی زندگی کے مقاصد اور انکی فکر کے انداز متعین کیا تھا۔

ہندوستان میں سلاطین کا مذہبی احساس وشعور مختلف سماجی قوتوں کے عمل اور ردعمل سے متاثر ہوا ہے۔شمالی ہندوستان میں مسلمان معاشرے کی حیثیت اول تو وہ مسلمان تھے۔جو غوریوں کے سیاسی تسلط سے قبل مختلف شہروں میں آباد ہو گیے تھے۔بعد حملہ منگول کے باعث صدہا مسلمان پناہ گزینوں کے حیثیت سے ہندوستان آئے۔ان میں گوزوال و انحطاط کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔لیکن سب آشوب دنیا وآشوب دہر کے ایک ہنگامے سے گزر رہے تھے۔جس نے ان سکو زندگی کے حقایق پر غور کرنے پر مجبور کیا تھا۔

سلاطین کے مذہبی افکار وروحانی دنیا پر مشائخ کے اثرات مثلاً خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، بابا فرید گنج شکر، شیخ بہاوالدین کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ان بزرگوں نے اپنی خاموش زندگی اور بے لوث خدمت خلق سے عوام وخواص سب ہی کو متاثر کیا تھا۔انکے اثرات مختلف نوع کے تھے۔اپنی بادمخالف کے تیز وتند جھونکوں کے درمیان اورانکی ضیا پاشیوں نے ہزاروں تیرہ تاریک زندگیوں کو روشناس کیا۔التتمش اور بلبن نے اپنے عہد میں مشائخ سے عقید تمندانہ تعلقات رکھے۔لیکن علاوالدین وہ خود کبھی شیخ نظام الدین اولیاء سے نہیں ملے۔لیکن درباریوں کے ذریعہ انکی تعلیم اور انکے اثرات اس تک پہنچتے رہے۔

> "ضیاء الدین برنی رقمطراز ہیں۔کہ جب علاوالدین کی فوجیں فتح ونصرت کے ڈنکے بجاتی ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئی۔اور جب دولتکی ہر طرف سے فراوانی ہوگئی۔سلطان کے اقتدار کا سکہ جم گیا تو دولت وقوت کے نشہ نے اس کا دماغی توزن خراب کر دیا اور اس نے ایک نیا مذہب جاری کرنے کے تدبیروں کے بارے میں سوچنے لگا۔برنی نے لکھا ہے کہ سلطان اکثر اپنی شراب کی محفلوں میں اس کا ذکر کرتا ہے۔"
>
> (ص نمبر 263 تاریخ فیروز شاہی)

لیکن جلال الدین کے افکار سے مسلم سوسائیٹی انداز فکر کرنے لگی۔علاوالدین نے جب ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالنی چاہی تو جس تنبیہ نے ان پر سب سے زیادہ اثر کیا وہ یہ تھی کی اس حرکت سے مسلمانوں میں ایسی بے چینی پیدا ہو جائیگی کہ سو برزجمہر بھی اسکو فرو نہ کر سکینگے۔اس نئے مذہب کے بنیاد کی وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتا تھا کہ اس کے اقتدار کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو جائے۔اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے یقیناً غلط راہ تلاش کی تھی جب اس میں ناکام ہوا تو اس سے رجوع کیا۔

"در مجلس شراب بگفتے۔ ودر پیدا آوردن دین و مذہب علیحیدہ
بامِلوک مجلس مشورت کردے و از حاضران بپرسیدے کہ چگونہ
چیزھا پیدا باید آورد تانام من دامن قیامت گیرد۔"

(تاریخ فیروز شاہی ص263)

فرشتہ رقمطراز ہیں کہ جب شیخ نظام الدین اولیاء و دیگر بزرگان دین کو سلطان کے اس ارادے کی خبر ہوئی تو وہ آزردہ خاطر ہوئے اور دعائے خیر کی۔

از وسواس شیطانی باآمدہ بر جادہ مستقیم شریعت مصطوفیہ ثابت و
راسخ گردد

(وسواس شیطانی سے نجات پا کر شریعت مصطفوی کے جادہ مستقیم پر قائم و ثابت رہے)

(تاریخ فرشتہ۔ جلد اول ص105)

جب 2 جمادی الثانی 689ھ (بمطابق 13 جون 1296ء) کو جلالالدین ستر 70 سال کی عمر میں دہلی کے تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوا۔ کیلوکھڑی کو اپنا دارالسلطنت بنا کر شہر نو کی تعمیر شروع کی۔ حکومت حاصل کرنے کے بعد وہ بلبن کے تخت پر بیٹھنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ اپنے آقاؤں کا وارث بن کر انکے تخت پر قابض ہو جانے کے بعد انکے دل میں خصوصاً آقائے بلبن کے لیے وہی قدر و منزلت تھی جو قبلا تھی۔ شہر نو کی تعمیر کی وجہ سے شہر کے اردگرد اچھا خاصا شہر آباد ہو گیا تھا۔ ایک بار جلال الدین قصر محل کے پاس گھوڑے سے اترا۔ اس پر اسکے وزیر احمد چپ نے اعتراض کیا۔ آپ کیا کر رہے ہیں۔ تو جلال الدین نے انکو خاموش کیا۔ اور کہا کیا تم سمجھتے ہو میں اپنے اصل کو بھول گیا ہوں۔ یہ اپنے آقا بلبن کے احسانوں کو فراموش کر چکا ہوں۔ بلکہ جب میں محل کے قریب ہوا۔ میرے دل پر ایک خاص ہیبت و خوف طاری ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا کہ بلبن اپنی قدیم شان و شوکت اور اہتمام کے ساتھ جلوہ افراز ہے۔ جلال الدین کی اس سادگی اور منسلک مزاجی نے آہستہ آہستہ ان سرکش ترکوں اور دہلی کے باشندوں کو زیر کر لیا۔ جو اب تک اسکو حقیر اور بادشاہت کے لیے نااہل تصور کرتے تھے۔ خواجہ نظام الدین احمد لکھتے ہیں کہ:

کجا عقل با شرع فتوی دہد۔۔۔ کہ اہل خرد دیں بدنیا دہد۔

(طبقات اکبری ص198)

سلطان کا مکارم اخلاق۔

جلال االدین کی طبیعت میں انکساری، حلم، حق گوئی، حق شناسی اور احترام مذہب کے جذبات سرایت کر گئے

تھے۔غرور وتکبّر اور خودنمائی بالکل نہیں تھی شاید یہی وجہ ہے کہ وہ حکومت وسیاست کا زیادہ خواہاں نہیں تھا۔

"ایک بار جلال الدین جب دولت خانہ میں داخل ہوئے۔تو دو رکعات نماز شکرانہ ادا کیا اور پھر سلاطین ماضیہ کے تخت پر بیٹھ کر ملوک وامرا کو اسطرح خطاب کیا۔میں خدا کا شکر کس طرح ادا کرسکتا ہوں۔کہ آج وہ تخت میرے پاوں کینیچے ہے جس کے سامنے مدتوں میں نے زمین پر سر رکھا ہے"

(و در دولت خانه فرد آمد و در دو رکعت نماز شکرانه بگذارد و بر تخت سلاطین ماضیه بر رفت و جلوس فرمود ودارن حالت ملوك و امرای دولت را نزدیك تر طلبیدو ببانگ بلند با ایشان گفت من چگونه شکرانه خدا توانم گفت-----)

(تاریخ فیروز شاہی ص نمبر 177)

ضیاءالدین برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں جلال الدین کے مکارم الاخلاق اور دینداری کی تعریف اس طرح کی ہے۔وہ پاک اعتقاد مسلمان تھا۔ اس کی طبیعت کی پاکی کا یہ عالم تھا۔کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "از آب حیات سر سشته بود"عصامی اور برنی دونوں نے ان کو حلیم وکریم کے لقب سے یاد کیا ہے۔

ایک بار جلال الدین بلبن کے سر جاندار (امیر) تھے۔سامانیہ کی نیابت اسکی حوالہ تھی،ایک شاعر سراج الدین عصامی جو سامانیہ کے مشہور شاعر تھے۔اسے لگان کی ادائگیت میں عمال سے کچھ شکایت ہوئی۔تو انھوں نے جلال الدین سیا سکی شکایت کی۔جلاالدین نے انکو کوئی تنبیہ نہیں کی اس پر سراج الدین کو رنج ہوا انہوں نے جلال الدین کی ہجو میں "خلجی نامہ" لکھی۔جب جلال الدین کو اس ہجو کی اطلاع ہوئی۔تو سراج کو ڈر پیدا ہوا۔وہ سامانیہ چھوڑ کے دوسری جگہ چلے گیے۔اسی زمانے میں جلال الدین نے کیتھل کے منڈاہیر پر حملہ کیا۔ایک منڈاہیر نے سلطان پر وار کیا ایسا زخم آیا کہ آخری عمر تک اس کا نشان باقی رہا۔جب جلال الدین کو فتح وکامرانی حاصل ہوئی۔تو سراج الدین اور منڈاہیر دونوں نے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لیے اور رشتہ داروں سے رخصت ہوکر دہلی پہنچے اپنی گردنوں میں رسیاں ڈال کر شاہی محل پر کھڑے ہوے۔جلال الدین جب محاصرہ کارزار سے فارغ ہوکر دہلی پہنچے تو دونوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔حاضر ہوکر علاوالدین بغل گیر ہوا۔اور انہیں خلعت شاہی اور جاگیر دے کر ندیمان خاص میں شامل کیا۔منڈاہیر کو بلاکر درباریوں کیسامنے انکی تعریف کی اور وکیل بنادیا۔سلطان کی اس عفوو کریم النفسی نے لوگوں کے دلوں کو اتنا متاثر کیا۔کہ عرصے تک اس واقعہ کی یاد انکے ذہنوں سے محو نہ ہوئی۔

جلال الدین کے مذہبی ودیگر طور طریقے۔

- سلطان جلال الدین نماز اور روزے کا بے حد پابند تھا۔ایک موقع پر خود کہتا ہے۔"من کہ روزے یک سپارہ قرآن بخوانم و پنج وقت نماز گزارم"
- احترام شرع کا جذبہ جلال الدین میں کافی گہرا تھا۔بعض اوقات نہایت صفائی سے اسکا اظہار کر دیتا تھا۔باغیوں اور سرکشوں کو سزائے موت دینے سے اس لیے تامل ہوتا تھا کہ " در شریعت پیغمبر ما جز کشیدہ او مرتد را آنکہ وجود زن بازن دیگر زنا کنند و دیگرے را کشتن بنیامدہ است"
(ترجمہ۔ہمارے پیغمبر کی شریعت میں سوائے قاتل مرتد اور شادی شدہ زانی کے اور کسی کو قتل کرنا نہیں آیا ہے)

برنی رقمطراز ہے اگر کوئی احکام شریعت اور معاملے کے خلاف ورزی کرتا ہوا نظر آیا تو وہ مطعون اور ساقط الاعتبار ہو جاتا۔

- شراب ارغونی کے دور خوب چلتا تھا بڑے بڑے گوئے اور موسیقی کے استاد آتے تھے۔محمد شہ اس وقت موسیقی کے استاد سمجھے جاتے تھے۔اور گانے والوں میں مفتوحہ اور نصرت خاتون خاص مقام رکھتی تھیں۔ناچنے میں نصرت بی بی اور مہرافروز یگانہ عصر تھیں۔۔امیر خسرو اور خواجہ حسن دہلوی کی غزلیں سنا سنا کر حاظرین کو مسحور کیا کرتے تھے۔
- اس عہد میں جرمانہ، دوسروں کے مال واسباب سے کھیلنا، لوگوں کے املاک اوقاف میں تصرف کرنا، میراث گذشتگان اور انکے ذخائر ودفائن پر نظر ڈالنا سخت سے سخت سزائے دے اور قید کر کے مسلمانوں کا مال چھیننا بلکل نظر نہیں آتا تھا۔
- اس عہد مبارک میں حاکموں کے خلاف شرع بات کہنا یا کرنا سخت غلط سمجھا جاتا تھا۔بادشاہ کے اندر خدا ترسی دکھائی دیتی ہے۔اسکے اعوان وانصار میں علم وعقل۔کرم وشفقت احکام شریعت کی پابندی اور معاملہ داری پائی جاتی ہے۔
- ایک بار جلال الدین محاصرہ رنتھبور کی مہم پر روانہ ہوا۔کچھ عرصہ محاصرہ کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ جب تک کافی سپاہوکس کی قربانی نہ دی جائیپر تو قلعہ فتح نہ ہوگا۔چنانچہ محاصرہ اٹھایا گا و اور دارالسلطنت کو یہ کہتا ہوا واپس لوٹا۔مس اس جسے دس قلعوں کو ایک نامور مسلمان کے مقابلہ مس ہ اچھانہس ج سمجھتا۔بھلے ایسے غنائم واسباب واموال دناج مس ک مرلےکس کام آینگے۔کہ اتنے مسلمان کے قتل ہونے کے بعد مرنے ہاتھ مس رآئے۔جس وقت عورتس س اور مقتولوں کے یمتک بچے مررے پاس آکر کھڑے ہونگے اس وقت اس قلعے سے جو کچھ مجھے حاصل ہوا ہوگا زہر سے زیادہ تلخ ہوگا۔

شیخ نظام الدین اولیاء اور سلطان جلال الدین خلجی

جلال الدین کے زمانے تک نظام الدین کی خانقاہ میں فتوح کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔وہ اپنے مریدوں کے ساتھ نہایت ہی تنگی کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔بعض دنوں میں پوری فصلیں گزر جاتی تھی وہ خربوزہ کی ایک قاش

تک نہیں لیتے تھے۔حالانکہ خربوزہ ان دنوں ایک جیتل کا من بھر ملتا تھا۔شیخ کے تمام مرید روزے رکھتے تھے۔بڑی دشواری سے وقت کاٹتے تھے۔اسکی خبر جب جلال الدین کو ہوئی۔تو انہوں نے کچھ تحائف بھیجے اور یہ درخواست کہ آپکی اجازت ہوں تو ایک گاؤں خدمت گاروں کے لیے مقرر کر دوں۔شیخ نے جواب دیا۔مجھے اور میرے خدمت گاروں کو تمہارے چنداں کی ضرورت نہیں ہے۔جلال الدین نے ملنے خواہش ظاہر کی۔تو شیخ منع کرتے رہے۔ایک بار سلطان بغیر اطلاع دئیں پہنچے اور امیر خسرو جو شیخ کے محبوب ترین مرید تھے انہوں نے شیخ کو اس بات کی اطلاع کی۔یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اپنے شیخ سے یہ ارادہ پوشیدہ رکھ کر انکے رنج کا سبب بنے۔چنانچہ شیخ ملاقات سے بچنے کے لئے اجودھن چلے گیے۔سلطان کو جب پتہ چلا۔تو امیر خسرو سے خفا ہو کر کہا۔"تو نے میرا بھید کھول دیا ہے اور اسلطان المشائخ کی پائے بوسی کی سعادت سے مجھے محروم کر دیا ہے"۔امیر خسرو نے جواب دیا۔"بادشاہ کے رنجیدہ ہونے بس خوف جان ہے۔لیکن رنجش سلطان المشائخ سے سلب ایمان کا خطرہ ہے"

جلال الدین خلجی اپنی پیرانہ سالی اور گہری مذہبیت کے باوجود ایک زندہ دل انسان تھے۔عیش وطرب کا شوق رکھتے تھے۔اسکے امراء کہا کرتے تھے۔بادشاہ سے شعر کہنے اور شعر سننے اور شطرنج کے سوا کیا آتا ہے لیکن برنی اسکے بر خلاف اچھی تصویر کھینچتے ہیں کہ دربار کا ماحول آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ایک طرف تاج الدین عراقی۔امیر خسرو۔موید دیوانہ۔صدر عالی تاج اسکے ندیم تھے۔جو سخن سنجی اور علم تاریخ وآداب ملوک میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔دوسری طرف ہیبت خان۔نظام خریطہ دار وغیرہ ساقیان مجلس تھے جس کے حسن وجمال کا یہ عالم تھا۔

"جو زاہد اور عابد انکے چہرے کا مشاہدہ کرتا زنّار باندھ لیتا تھا اور مُلا کو بوریا خمار خانہ بنا لیتا تھا۔بسوئے خماران کھنچتا تھا۔اوران توبہ شکن حسینوں کے عشق میں رسوا ہوتا تھا۔"

جلال الدین کا قتل ماہ صیام کے مہینے میں انتہائی حسرت ناک طریقے سے ہوئی۔جب وہ اپنے بھتیجے اور داما دعلاوالدین سے ملنےجا رہے تھے۔وقت افطار کے بعد قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ ہوئے۔کہ نصرت خان کے اشارے پر محمود سلیم نے اس پر حملہ کیا۔اسکا وار خطا ہو کر اپنے ہاتھ پر لگا۔پھر اختیار الدین نے دور سے سلطان کو زمین پر گرا دیا۔اسکا سر تن سے جدا کیا۔برنی تاریخ فیروز شاہی کے حوالے سے لکھتا ہے۔

"شنیدم کہ سلطان جلال الدین در حالت سر بریدن در کلمہ شہادت
گفت انزدیک افطار بدولت شہادت رسید"

کتابیات:

طبقات اکبری، خواجہ نظام الدین، 1990، اردو سائنس بورڈ، مترجم محمد ایوب قادری
تاریخ فیروز شاہی، ضاء ۰ الدین برنی، تصحیح سر سید احمد خان، سر سید اکیڈمی 2005

خاندان خلجی، مصنف/ کے۔ایس۔لال/ 1980، ترقی اردو بیورو دہند، مترجم/ ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی
سفرنامہ ابن بطوطہ (رحلہ ابن بطوطہ)، مترجم دکتر محمد علی موحد، تہران 1359ھ
سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، پروفیسر خلیق احمد نظامی، ادارہ ادبیات دہلی 1985
خلاصۃ التواریخ، سجان رائے بتالوی، ڈاکٹر محمد ریاض الدین خان، دریا گنج دہلی 2012

☆☆☆

پروفیسر رضوان اللہ آروی
پٹنہ، بہار

بہار کے فارسی اساتذہ سیریز۔۴

پروفیسر اقبال حسین

بہار کے فارسی اساتذہ میں پروفیسر اقبال حسین، غالباً فارسی کے ایسے واحد استاد تھے جن کے آبا و اجداد نے سرکار انگلیشیہ کی خدمت اور وفاداری کے صلے میں ’خان بہادر‘ کا خطاب بھی حاصل کیا تھا اور حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز بھی ہوئے تھے۔شرفاء کا یہ طبقۂ اعلی، زمینداری کے دور میں ممتاز مقام کا حامل تھا۔(آج بھی یہ خانوادہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے) اور اپنی علمی لیاقت اور منصبی جلالت کی بنا پر عام لوگوں کی نگاہ میں بیحد قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔اپنے خانوادے کی ان امتیازی خصوصیات کو خود پروفیسر اقبال حسین نے اپنی خودنوشت سوانح حیات ’داستاں میری‘ میں تفصیل سے قلم بند کیا ہے جس میں نہ صرف ان کا خاندانی پس منظر نمایاں ہوا ہے بلکہ اُس پُرآشوب عہد کی پوری تصویر مجسم ہوگئی ہے۔

پروفیسر اقبال حسین ۲۲؍نومبر ۱۹۰۵ء میں عالم وجود میں آئے۔ان کا بچپن، پٹنہ سے چند میل کی دوری پر واقع نیورہ گاؤں کے وسیع و عریض مکان میں گزرا جہاں ان کے خاندان کی زمینداری تھی۔اسکول کی ابتدائی تعلیم کا آغاز دمکا سے ہوا جہاں ان کے والد بہ سلسلہ ملازمت مقیم تھے۔بعد میں جب ان کے والد کا تبادلہ بہار کے مختلف شہروں مثلاً آرہ، سہسرام اور مظفر پور وغیرہ میں ہوا تو اقبال صاحب نے بھی انہی شہروں کے مختلف اسکولوں میں داخلہ لے کر اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔مظفر پور ہی کے ایک اسکول اور کالج سے انہوں نے بالترتیب میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔بعد ازاں وہ پٹنہ منتقل ہوئے اور یہاں کے باوقار پٹنہ کالج سے فارسی آنرز کے ساتھ گریجویشن کیا اور پوری یونیورسٹی میں پہلا مقام حاصل کیا۔پھر اسی امتیاز کو برقرار رکھتے ہوئے ۱۹۲۸ء میں انہوں نے اسی کالج سے ایم اے (فارسی) کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی اور تمغۂ طلائی سے سرفراز ہوئے۔چونکہ پروفیسر اقبال حسین کے خاندان میں وکیلوں اور ججوں کی خاصی تعداد موجود تھی، لہٰذا انہوں نے خاندانی روایات کے مطابق ایل ایل بی کے امتحان میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی اور اپنے پیشہ ورانہ کیریئر کا آغاز بھی مظفر پور کی ضلع عدالت میں وکالت ہی سے کیا۔لیکن وکالت سے ذہنی مناسبت نہ ہونے کے سبب جلد ہی انہوں نے اس پیشہ کو ترک کر دیا اور فارسی میں پی ایچ ڈی کرنے کے

لئے پٹنہ واپس آ گئے۔ واضح رہے کہ اُس زمانے میں کسی نے بھی پٹنہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی نہیں کی تھی۔ اقبال حسین صاحب کو پہلی بار یہ شرف حاصل ہوا۔ وہ اپنے استاد گرامی ڈاکٹر عظیم الدین احمد صاحب کی نگرانی میں The Early Persian Poets of India کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند سے سرفراز ہوئے۔ اس کے دوسال بعد ۱۹۳۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی نے اس مقالے کو کتابی شکل میں شائع کیا۔ بعد ازاں ۱۹۸۰ء میں اسی یونیورسٹی سے اس کی دوسری اشاعت عمل میں آئی۔

اقبال حسین صاحب کی تدریسی ملازمت کا باضابطہ آغاز ۲۶ راگست ۱۹۳۵ء سے ہوا جس دن انہوں نے راونشا کالج کٹک میں فارسی لکچرر کی حیثیت سے جوائن کیا۔ لیکن جلد ہی ان کا تبادلہ ان کے مادر علمی پٹنہ کالج، پٹنہ میں ہو گیا اور وہ یہاں واپس آ کر تدریسی خدمات انجام دینے لگے۔ بعد میں ترقی کرتے ہوئے وہ یونیورسٹی پروفیسر ہوئے اور صدر شعبہ فارسی (پٹنہ یونیورسٹی) کے منصب جلیل پر بھی فائز ہوئے۔ شعبہ فارسی کی صدارت کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب پہلی بار ۱۹۴۴ء میں پٹنہ یونیورسٹی نے انہیں یہ پیشکش کی تو پروفیسر اقبال حسین نے صرف اس خیال سے اس پیشکش کو قبول نہیں کیا کہ اُن کے صدر بن جانے سے، اُن کے استاد پروفیسر عبدالمنان بیدل کو ان کی ماتحتی میں کام کرنا ہوگا اور یہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ اس حقیقت کا انکشاف خود پروفیسر اقبال حسین نے، ڈاکٹر سید شاہد اقبال صاحب کے ساتھ ایک گفتگو کے دوران کیا تھا۔ اس قصہ کو ڈاکٹر سید شاہد اقبال صاحب نے اپنی کتاب میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

> ''غرض، پروفیسر اقبال حسین صاحب نے پٹنہ یونیورسٹی کی پوری تاریخ بیان کر دی اور میں خاموشی سے نوٹ کرتا رہا۔ انہوں نے ایک دلچسپ حقیقت بیان کی کہ جب وہ بہار ایجوکیشن سروس کلاس ون سے نوازے گئے تو یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء کو پٹنہ یونیورسٹی نے انہیں فارسی کا صدر شعبہ مقرر کرنا چاہا۔ لیکن انہوں نے اس بنا پر ہیڈ بننے سے انکار کر دیا کہ پروفیسر عبدالمنان بیدل کو ان کی ماتحتی میں کام کرنا پڑے گا۔ پروفیسر اقبال حسین یہ نہیں چاہتے تھے، کیونکہ پروفیسر عبدالمنان ان کے استاد رہ چکے تھے۔ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی جسکی مثال بہت کم ملے گی۔''

(نشر تحقیق ص ۱۱۵)

حالانکہ بعد میں انہیں شعبہ فارسی کی سربراہی تفویض ہوئی۔ اُس زمانے میں صدر شعبہ کو، پٹنہ کے دیگر علمی و ادبی اور تحقیقی اداروں (مثلاً مدرسہ شمس الہدیٰ اور خدابخش لائبریری وغیرہ) کے فلاحی منصوبوں پر بھی کام کرنا ہوتا تھا۔ ان ذمہ داریوں کو بھی انہوں نے بحسن وخوبی انجام دیا۔ اسی دوران انہیں یونیورسٹی میں سینیٹ کا ممبر نامزد کیا گیا، آرٹس فیکلٹی کا ڈین بھی بنایا گیا اور پٹنہ کالج ہاسٹل کا سپرنٹنڈنٹ بھی۔ بعد ازاں انہیں پٹنہ کالج کے پرنسپل کا باوقار عہدہ بھی تفویض ہوا جہاں

کالج کی ترقی کے لئے وہ بیحد فعال اور سرگرم رہے اور اپنی بہترین انتظامی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی کسی نہ کسی حیثیت سے وہ حکومت کے باوقار اداروں سے وابستہ رہے۔ مثلاً پہلے انہیں بہار پبلک سروس کمیشن کا ممبر بنایا گیا اور پھر خدابخش لائبریری کے ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی) کی ایک اسکیم کے تحت انہوں نے پٹنہ یونیورسٹی میں ویزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس ذمہ داری سے سبکدوشی کے بعد انہیں مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کی صدارت تفویض ہوئی اور جب ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ کی تشکیل کا مرحلہ آیا تو اقبال صاحب کو ہی اس کا کنوینر بنایا گیا۔ پروفیسر اقبال حسین اور ان کی ٹیم کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت ہی ادارہ تحقیقات کا خاکہ مرتب ہوا، پھر اسے عملی شکل دی گئی اور ایک ڈائرکٹر کو بحال کر کے باضابطہ یہاں سے تعلیمی و تدریسی اور تحقیقی سرگرمیوں کا آغاز کیا گیا جو آج تک جاری ہے۔ پروفیسر اقبال حسین کی مجموعی علمی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۶ء میں صدر جمہوریہ ہند نے انہیں سند اعزاز سے نوازا۔ اس کے علاوہ فارسی اساتذہ کی کل ہند انجمن نے بھی دانشگاہ لکھنؤ میں منعقد انجمن کی ایک کانفرنس میں ۱۹۸۱ء میں انہیں 'استاد ممتاز' کے اعزاز سے سرفراز کیا۔

پروفیسر اقبال حسین کی شادی اُس زمانے کے معروف بیرسٹر مسٹر ریاست حسین کی اکلوتی بیٹی فخر النسا سے ہوئی تھی۔ اللہ نے انہیں تین بیٹوں سے نوازا۔ مقبول حسین، اکبر حسین اور اشرف حسین۔ تینوں اعلا تعلیم حاصل کر کے مناصب بلند پر پہنچے اور سرخروئی کے ساتھ سبکدوش ہوئے۔ اقبال حسین صاحب مع خاندان دو بار حج وعمرہ کی سعادت سے بھی فیضیاب ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۵ر فروری ۱۹۹۱ء میں ہوا اور پٹنہ کے پیر موہانی قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔

پروفیسر اقبال حسین کی تخلیقات اور ان کی تحقیقی تصنیفات کے سلسلے میں سب سے پہلے ان کی کتاب The Early Persian Poets of India کا نام آتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، اُن کے اسی تحقیقی مقالے پر پٹنہ یونیورسٹی نے سب سے پہلے انہیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند سے نوازا تھا۔ انگریزی میں لکھی ہوئی یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ بعد میں اردو اور فارسی میں اس کے تراجم بھی ہوئے۔ اردو ترجمہ تو پٹنہ سے ہی بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام شائع ہوا، جبکہ فارسی ترجمہ کی اشاعت ایران سے ہوئی۔ اس کے علاوہ پروفیسر اقبال حسین کی علمی وادبی شخصیت کا ایک اہم شناسنامہ تذکرہ 'تحفہ سامی' کی تدوین واشاعت بھی ہے سام میرزا کا یہ اہم تذکرہ اگرچہ ایران میں لکھا گیا، لیکن اس کی تدوین واشاعت کا شرف سب سے پہلے پروفیسر اقبال صاحب کو حاصل ہوا جنہوں نے ۱۹۳۴ء میں اس تذکرہ کو پٹنہ سے شائع کیا۔ بعد میں یہ تذکرہ ایران سے بھی شائع ہوا۔ ایک محقق اور مدوّن کی حیثیت سے پروفیسر اقبال صاحب کو امتیازی مقام عطا کرنے والی یہ کتابیں اپنی جگہ، لیکن اُن کی جس کتاب کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی، وہ اُن کی خودنوشت سوانح حیات 'داستاں میری' ہے جو، ان کی زندگی کے آخری ایام میں شائع ہوئی اور انہیں شہرت دوام عطا کرگئی۔

بتیس (۳۲) ابواب اور پانچ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل یہ جامع اور ہمہ جہت خودنوشت نہ صرف اقبال حسین صاحب کی ادبی شخصیت کی شناخت اور ترجمان ہے بلکہ ان کے عہد کی تاریخی، تہذیبی، ثقافتی، ادبی اور سیاسی و سماجی منظرنامے کا بھی ایک اہم حوالہ ہے۔ یہ آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی ہے جس میں اقبال صاحب کے معاصرین اور اُس دور کی اہم شخصیتوں کے حالات زندگی اور ان کے علمی و ادبی کارنامے بھی سمٹ آئے ہیں۔ اقبال حسین صاحب کا تعلق شرفاء کے اُس خانوادے سے تھا جو اعلاتعلیم سے آراستہ تھا اور سرکار انگلیشیہ کا وفادار تھا۔ چنانچہ ان کے آباء واجداد کو اسی وفاداری کے صلے میں نہ صرف بڑے عہدوں سے نوازا گیا بلکہ 'خان بہادر' جیسے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا۔ اقبال حسین صاحب کے پردادا منشی حیدر بخش بھی انہیں میں سے ایک تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں نہ صرف انگریزوں کی مدد کی تھی بلکہ مظفر پور میں سرکاری خزانہ کی حفاظت بھی کی تھی۔ کتاب کے دوسرے باب میں اقبال صاحب نے اس واقعہ کی تفصیل بیان کی ہے۔ نو (۹) ابواب پر مشتمل کتاب کا پہلا حصّہ مصنف کے خاندان اور ان کے آباء اجداد کے ذکر کے لئے مختص ہے جس میں ان کے پردادا منشی حیدر بخش، دادا مولوی امجد حسین اور چھوٹے دادا خان بہادر حشمت حسین کے حالات شامل ہیں۔ مصنف کے مفصل بیانیہ سے ان شخصیات کی سیرت و سوانح کے ساتھ اس دور کی انگریزی طرز معاشرت بھی نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے۔ اس معزز خانوادے کا تعلق پٹنہ سے چند میل کی دوری پر واقع، قصبہ نیورہ سے تھا جہاں کے مشاہیر کے حالات زندگی کے ساتھ تحریک آزادی میں ان کی بیش بہا خدمات کا ذکر بھی اقبال صاحب نے تفصیل سے کیا ہے۔ انہی مشاہیر میں سید حسن امام بھی تھے جنہوں نے تحریک ترک موالات میں نہ صرف مہاتما گاندھی کی حمایت کی تھی بلکہ انہیں کثیر مالی امداد بھی فراہم کی تھی۔ پروفیسر اقبال صاحب کے والد احمد حسین صاحب اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے لہذا بہت ناز و نعم میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ علیگڑھ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بہار کے مختلف مقامات پر وہ اہم انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ پروفیسر اقبال صاحب نے کتاب کا ایک باب اپنے ننیہال کے ذکر کے لئے بھی مخصوص کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نانا محمد یحییٰ صاحب کو بھی انگریزوں نے ان کی خدمات کے عوض نوازا تھا اور اعزازی مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز کیا تھا۔ اپنے ذوق کی بنا پر خدابخش خاں (بانی کتابخانہ خدابخش) سے بھی ان کے قریبی تعلقات تھے۔

کتاب کا دوسرا حصّہ، جو مجموعی طور پر بائیس (۲۲) ابواب پر مشتمل ہے، بیحد اہم ہے جس کے ابتدائی ابواب میں پروفیسر اقبال حسین نے اپنی پیدائش کے ساتھ بہار کے مختلف مقامات پر اپنے حصول تعلیم کا احوال بھی بیان کیا ہے۔ اسی ذیل میں انہوں نے خاص طور پر اپنے فارسی اساتذہ ڈاکٹر عظیم الدین احمد اور پروفیسر عبدالقادر کا ذکر بھی کیا ہے۔ واضح رہے کہ عظیم الدّین صاحب، علامہ اقبال کے قریبی دوستوں میں تھے اور پٹنہ آنے سے قبل وہ اورینٹل کالج (پنجاب یونیورسٹی لاہور) میں فارسی کے استاد ہوا کرتے تھے۔ انہی کی زیرنگرانی اقبال صاحب نے 'ہندوستان کے قدیم

فارسی شعرا' کے موضوع پر انگریزی میں تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند حاصل کی تھی۔ کتاب کے کئی ابواب اقبال صاحب کی ملازمت کی تفصیلات اور اُن مختلف اداروں اور اُن سے متعلق افراد کے مفصّل ذکر پر مشتمل ہے جن اداروں سے وہ وابستہ رہے تھے۔ چونکہ وہ زمانہ 'ہندوستان چھوڑو تحریک' کے شباب کا زمانہ تھا۔ لہذا پٹنہ میں اس تحریک کی سرگرمیوں کی روداد بھی کتاب کا ایک اہم حصّہ ہے۔ اسی طرح ۱۹۴۴ء سے ۱۹۵۱ء تک کے درمیان اپنی پروفیسری کے حالات بیان کرتے ہوئے اقبال صاحب نے اس زمانہ میں رونما ہونے والے ہندو مسلم فسادات پر بھی نظر ڈالی ہے اور اسی ضمن میں اہم مسلم رہنماؤں کی سیرت وشخصیت کو بھی اجالا ہے۔ ان رہنماؤں میں پروفیسر عبدالباری بھی شامل ہیں۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۰ء تک اقبال صاحب نے صدر شعبہ فارسی کی حیثیت سے پٹنہ یونیورسٹی میں خدمات انجام دیں۔ اس دوران انہیں آرٹس فیکلٹی کا ڈین بھی بنایا گیا اور پٹنہ کالج کے پرنسپل شپ کا عہدہ بھی تفویض ہوا۔ اس دورانیہ کے بیان میں اس عظیم دانشگاہ کا پورا منظر وپس منظر اپنی تمام علمی وادبی سرگرمیوں سمیت سمٹ کر آ گیا ہے۔ اور اُن افراد کا ذکر اس پر مستزاد ہے جو اس دانشگاہ کی ترقیوں میں ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ انتظامی عہدوں پر رہنے کے سبب اس زمانے کے سیاسی رہنماؤں اور اعلا افسران سے بھی اقبال صاحب کی ملاقاتیں ہوتی تھیں جن سے مل کر وہ مختلف علمی اداروں کے ترقیاتی منصوبوں کو نافذ کرانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان سب افراد کا تذکرہ اس کتاب کو سیاسی وسماجی جہت بھی عطا کرتا ہے۔ ان اداروں میں پٹنہ یونیورسٹی اور پٹنہ کالج کے علاوہ، مدرسہ شمس الہدی، ادارہ تحقیقات عربی وفارسی اور خدا بخش لائبریری جیسے ادارے بھی شامل تھے جن سے کسی نہ کسی حیثیت سے اقبال صاحب کی وابستگی تھی۔ ان اداروں کے ذکر کے ذیل میں اقبال صاحب نے فارسی کے چند ناموراساتذہ مثلاً پروفیسر سید حسن، پروفیسر شاہ عطاء الرّحمٰن عطا کاکوی، ڈاکٹر سید علی حیدر نیر، پروفیسر فیاض الدّین حیدر اور ڈاکٹر اطہر شیر کی حیات وخدمات پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔

تعلیم اور ملازمت کی روداد ختم ہوئی تو اقبال صاحب نے اپنی ازدواجی زندگی اور خاندانی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اسی ذیل میں انہوں نے اپنے مقدس سفر حج وزیارت کی روداد بھی بیان کی ہے۔ جس سے اس کتاب میں سفرنامہ کا لطف بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی اور ایسے پہلو ہیں جس نے اس کتاب کو ہشت پہل بنا دیا ہے۔ مثلاً خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف اور وہاں کے بزرگوں سے مصنف کی مسلسل ملاقاتوں کی روداد نے اس کتاب کو ایک تقدیسی شان بھی عطا کر دی ہے۔ اسی طرح 'میرے چند قابل ذکر معاصرین' کے تحت ایک مستقل باب نے اس کتاب کو خاکہ نگاری کا بھی ایک عمدہ نمونہ بنا دیا ہے۔ ان معاصرین میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ہمایوں کبیر کے علاوہ سید نورالہدی، سر عبد الرّحیم، سر سلطان احمد، خان بہادر محمد فخر الدّین، سید عبدالعزیز سابق وزیر تعلیم بہار، مسٹر محمد یونس سابق وزیر اعلا بہار، پدم شری پروفیسر کلیم الدّین احمد، مبارک عظیم آبادی، قاضی عبدالودود، سید مہدی امام، سر علی امام اور جسٹس سید حسن وغیرہ شامل

ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب ایک ایسے پُر آشوب عہد کے تلخ وشیریں واقعات کا ایک مرقع ہے جس کے آئینے میں دو ہندوستان کا عکس نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔آزادی سے قبل کا ہندوستان اور آزادی کے بعد کا ہندوستان۔خاص بات یہ ہے کہ اقبال صاحب کا بیانیہ ان کے مشاہدات پر مبنی ہے اور اس پر مستزاد واقعات کا ایماندارانہ اور غیر جانبدارانہ تجزیہ ہے۔ان سب خصوصیات نے مل کر اس کتاب کو ایک دستاویزی حیثیت بخش دی ہے۔

پروفیسر اقبال حسین کے تحقیقی کارناموں میں ایک اہم تحقیقی کارنامہ سام میرزا کے تذکرہ 'تحفہ سامی' کی تدوین و اشاعت ہے۔جیسا کہ عرض کیا گیا یہ تذکرہ اگرچہ ایران میں لکھا گیا لیکن اس کی تدوین واشاعت کا شرف سب سے پہلے پروفیسر اقبال حسین کو حاصل ہوا۔فارسی شعراء کے تذکرہ نویسوں کے درمیان،سام میرزا کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ خود بھی شعر کہتا تھا اور شعراء کے حالات جمع کرنے اور ان کے بہترین اشعار کا انتخاب کرنے کے ساتھ ان سے ملاقات کرنے میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔چنانچہ اسی مقصد سے اس نے ایران کے مختلف شہروں کی سیاحت کی اور ہمعصر عالموں،دانشوروں،ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتیں کیں۔پروفیسر اقبال حسین نے لکھا ہے :

"در ممالك ایران بسیار سفر کرده و گروہی از دانشمندان و سخنوران آن عصر را دیدن کرده۔"

(دیباچہ تحفہ سامی۔مطبوعہ علیگڑھ۔ص۴)

انہی سخنوران اہل صفا کے حالات اور ان کا نمونہ کلام 'تحفۂ سامی' کا نشان امتیاز ہے۔پروفیسر اقبال حسین ،جنہیں پہلی بار 'تحفۂ سامی' کی تدوین واشاعت کا فخر حاصل ہے،اس ضمن میں لکھتے ہیں :

"این تذکره محتویست بر شرح احوال بزرگان و سخندان معاصر خود مؤلف که بسیاری از آنان به حضورش رسیده و با وی آشنائی شخصی داشته اند۔سام میرزا در ذکر احوال شعرای ہمعصر خود مقداری از اشعار آنان را بطور نمونه ضبط نموده است۔"

(دیباچہ تحفہ سامی۔مطبوعہ علیگڑھ۔ص۲)

چونکہ یہ تذکرہ اُن شعراء کے حالات پر مشتمل ہے جو نہ صرف سام میرزا کے معاصر تھے بلکہ ان میں سے بیشتر کے ساتھ اس کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔لہذا ان کے بارے میں سام میرزا کی براہ راست اطلاعات،بعد کے تذکرہ نگاروں کے لئے مستند ماخذ بنیں اور 'تحفۂ سامی' سے استفادہ کا دائرہ پھیل کر والہ داغستانی (مؤلف ریاض الشعرا) آذر(

مؤلف آتشکدہ) اور رضا قلی خاں ہدایت (مؤلف مجمع الفصحا) تک پہنچ گیا۔ان میں سے بعض تذکرہ نگارنے تو سام میرزا کے معاصر شعرا کے حالات بیان کرنے میں کم وبیش اسی کے بیانات کو نقل کر دیا ہے۔ پروفیسر اقبال حسین نے لکھا ہے:

" اغلب تذکرہ ھا کہ پس از تحفہ سامی برشتہ نگارش در آمدہ ،در بیان تراجم احوال و آثار شعرای ھمزمان سام میرزا کم و بیش عبارت تحفہ سامی را نقل کردہ اند ۔ "

(دیباچہ تحفہ سامی۔مطبوعہ علیگڑھ۔ص۲)

خوش قسمتی سے اس تذکرہ کے دو نسخے خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں،جن کی کتابت مؤلف کی حیات میں با لترتیب ۹۶۸ھ اور ۹۷۱ھ میں ہوئی۔اور اب تک کی اطلاع کے مطابق یہ دونوں نسخے قدیم ترین نسخے ہیں ۔ان دونوں نسخوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے پروفیسر اقبال حسین نے لکھا ہے :

"این کتاب اہمیتی دیگر داردو آن اینست کہ بسیار نادر و کمیاب است۔چنانچہ در ہمہ بلاد ہندوستان ظاہراً بیشتر از دو نسخہ ہای خطی معتبردرنظر احقر نماندہ۔ این دو نسخہ در کتابخانہ مشرقی عمومیہ در پتنہ محفوظ اند۔ نسخہ اول کہ شمارہ دو صد و نُہ دارد ،در سنہ نہصد و شصت و ھشت یعنی شانزدہ سال قبل از وفات مؤلف مرقوم شدہ ونسخہ دیگر کہ شمارہ دو صد و دہ دارد ،در سنہ نُہصد و ہفتاد و یك یعنی سیزدہ سال قبل از وفات مؤلف مکتوب گشت۔این دو نسخہ از ہمہ نسخہ ہای دیگر اقدم و افضل و نادر اند۔از معائنہ و مقابلۂ فہرست کتب خانۂ مشہورہ ظاہر می شود کہ در تمام دنیا نسخۂ قدیم تر ازیں دو نسخہ ھیچ جا یافت نمی شود۔ "

(دیباچہ تحفہ سامی۔مطبوعہ پٹنہ)

یہ بات صحیح ہے کہ تحفہ سامی میں تاریخ تالیف کا ذکر نہیں ہے۔تاہم کچھ داخلی شواہد کی بنیاد پر محققین نے ،جس میں پروفیسر براؤن بھی شامل ہیں،اس کتاب کا سنہ تالیف ۹۵۷ھ قرار دیا ہے۔اس طرح 'تحفۂ سامی' کے پہلے نسخے کی کتابت،اس کی تالیف کے صرف گیارہ سال بعد ۹۶۸ھ میں ہوئی ہے جو خدا بخش لائبریری میں موجود ہے اور جس کو اساسی نسخہ قرار دے کر پروفیسر اقبال حسین نے اس کی تدوین کی ہے۔تاہم انہوں نے اس کتاب کے صرف صحیفۂ پنجم کو

تدوین واشاعت کے لئے منتخب کیا اوراس کی وجہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے خود لکھا ہے کہ بظاہر یہ خلاف اصول معلوم ہوتا ہے کہ چار صحائف کو چھوڑ کر پانچویں صحیفہ کو منتخب کیا جائے ۔لیکن ایسا اس لئے کیا گیا کہ یہ صحیفہ خاص طور پر شعرا کے لئے مخصوص ہے اوراسی لئے یہ دیگر تمام صحائف پر فوقیت رکھتا ہے:

" بابت تقدیم طبع صحیفۂ پنجم بر ہمہ صحائف کہ بظاہر خلاف اصول و خارج از قاعدہ معلوم می شود ،عرض می نمایم کہ در صحیفہ پنجم ذکر شعراء مقرر کہ صیت ایشان در آفاق دنیا رسید ،مسطور است ۔و بنا برین این صحیفہ را بر سائر صحائف فوقیت دادم و بیشتر از ہمہ بطبع رسانیدم۔"

(دیباچہ تحفہ سامی۔علیگڑھ۔ص۵)

پروفیسر اقبال حسین کی یہ کتاب شائع ہو کر جب ایران پہنچی تو معروف ایرانی محقق وحید دستگردی اسے دیکھ کر چونک گئے ۔اس لئے کہ 'تحفہ سامی' کا ایک ایرانی قلمی نسخہ پہلے سے ان کی نگاہ میں تھا۔ جو آقای نجم آبادی کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھا۔اگر چہ ان کی اطلاع کے مطابق ،طہران میں بھی اس کتاب کے قلمی نسخے موجود تھے لیکن وہ ان کی دسترس سے دور تھے لہذا وہ ان سے استفادہ نہ کر سکے اوراسی واحد نسخے کی بنیاد پر انہوں نے اس کی تدوین کی اوراس کا اعتراف بھی کیا کہ کتاب کے صحیفہ پنجم کی ترتیب وتدوین میں انہیں پروفیسر اقبال حسین کی کتاب سے بہت مدد ملی:

" تحفۂ سامی بسیار کمیاب است و در تہران جز دو یا سہ نسخہ بیشتر یافت نمی شود ۔و نفیس ترین و بہترین آن نسخہ ،نسخہ ایست کہ در کتابخانہ نخبہ خاندان فضل و ادب آقای نجم آبادی موجود و اینک دو سہ ماہست کہ در دسترس ما بودہ و شالودہ طبع این کتاب (تحفہ سامی) ہمان نسخہ گرانبہاست۔یکی یا دو نسخہ دیگر کہ در طہران یافت می شود از دسترس و استفادہ دور و بہمیں سبب ما نتوانستیم برای مقابلہ و تصحیح نسخہ دیگری در دست داشتہ باشیم۔ صحیفہ پنجم از تحفہ سامی در سال پیشینہ ہزار و سہ صدو پنجاہ و سہ ھجری قمری بمساعی جمیلہ فاضل مقدام و دانشمند ہمام مولوی اقبال حسین در دار ا لفنون پتنہ ہندوستان بطرزی مرغوب طبع و منتشر شدو

یك نسخه آن به اداره ارمغان ارسال گردیدو در تصحیح صحیفه پنجم
کمك بزرگی بما کرد۔چنانکه تصور می رود در صحیفه پنجم از کتاب
ما دیگر هیچگونه غلط و اشتباهی وجود نداشته باشد۔"

(دیباچہ تحفہ سامی ۔ وحید دستگردی۔ مطبوعہ ایران۔ ص۴)

وحید دستگردی کی یہ کتاب پٹنہ کی اشاعت کے صرف دو سال بعد ۱۹۳۶ء میں ایران سے چھپ کر منظر عام آ گئی۔اور اس کے ۳۷ رسال بعد ۱۹۷۳ء میں پروفیسر اقبال حسین کی مرتبہ 'تحفہ سامی' علیگڑھ یونیورسٹی سے شائع ہوئی ۔پھر اس کے ۳۲ رسال بعد ۲۰۰۵ء میں، ایک اطلاع کے مطابق، یہ کتاب ڈاکٹر رکن الدّین ہمایوں فرخ کے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ ایران سے از سر نو شائع ہوئی ہے۔یہ سچ ہے کہ 'تحفہ سامی' کی یہ ایرانی اشاعتیں نقش ثانی اور نقش ثالث کی حیثیت رکھتی ہیں اور نقش اوّل کا فخر پٹنہ کی اشاعت کو ہمیشہ حاصل رہے گا جہاں سے یہ کتاب ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی تھی۔لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ پٹنہ کی اشاعت ادھوری تھی کہ اس میں 'تحفہ سامی' کے صرف ایک صحیفہ کو شائع کیا گیا تھا۔جبکہ ایرانی اشاعتوں میں 'تحفہ سامی' کے ساتوں صحائف کا مکمل متن شائع کیا گیا ہے، جو بالترتیب سلاطین و شاہزادگان، علماء کرام و سادات عظام، وزراء و اہل قلم، شعراء و سخنوران، طبقہ ترکان اور سایر عوام کے ذکر کے لئے مخصوص ہے۔

'تحفہ سامی' کا صحیفہ پنجم کتاب کا اہم ترین باب ہے جو صرف شعراء کے لئے مخصوص ہے اور جن کی تعداد تقریباً سات سو ہے۔یہ باب جامؔی جیسے معروف شاعر سے شروع ہو کر ایک غیر معروف شاعر خواجہ فخر الدّین جفائؔی کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔جامؔی کے علاہ، ملا ھلالی، ملا ھاتفی، مولانا نظام معمائی، بابا فغانی، اھلی شیرازی، مولانا حیرتی، قاضی علائی، شوقی یزدی، وحیدی قمی۔زلالی ھروی، غواصی خراسانی اور لسانی شیرازی جیسے بڑے اور اہم شعراء اس باب کی زینت ہیں جن کا ذکر سام میرزا نے قدرے تفصیل سے کیا ہے اور شاعری کی ہر صنف سے ان کے اشعار کے نمونے پیش کئے ہیں۔اس باب میں تذکرہ نگار کا ناقدانہ شعور اور تجزیاتی ذہن زیادہ بالیدہ اور متحرّک نظر آتا ہے کہ اُس نے ان اہم شعراء کے موضوعات کے ساتھ ان کے اسلوب پر بھی گفتگو کی ہے۔ان میں سے بیشتر شعراء، سام میرزا کی علمی و ادبی صحبتوں سے فیض حاصل کر چکے تھے۔سام میرزا نے خود اس کا اظہار کیا ہے۔بابا فغانی کے ذکر میں اس کی شراب نوشی و بدمستی کا عبرت انگیز بیان کرتے ہوئے سام میرزا نے اُس کا وہ مشہور شعر نقل کیا ہے جو ہندوستان میں بھی بہت مشہور ہوا اور اس پر یہاں کے شعراء نے بھی تضمینیں کی ہیں:

نخل قدت که از چمن جان بر آمده
شاخ گلی بصورت انسان بر آمده

ملا اھلی شیرازی کے ذکر میں سام میرزا نے اس بات پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ وہ ذو بحرین مثنوی کہنے کے ساتھ تجنیس کا استعمال اتنی قدرت ومہارت سے کیسے کر لیتا تھا۔اسی باب میں مولانا مخفی رشتی کا بھی ذکر ہے، جن کے اشعار کو، کہتے ہیں کہ، زیب النساء مخفی سے منسوب کر دیا گیا ہے۔اتنی کثیر تعداد میں شعراء کے مفصّل حالات لکھنا ممکن نہیں تھا، چنانچہ بیشتر شعراء کے ذکر میں مؤلف نے اختصار سے کام لیا ہے۔لیکن ایسے شعراء کے بیان میں، جن سے اُس کے ذاتی مراسم تھے، وہ نہ صرف تفصیل واطناب سے کام لیتا ہے بلکہ خود اُن شعراء کے بیانات کو بھی نقل کرتا ہے جس سے اُن کے حالات اور اُن کی شاعری کا پس منظر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ان شعراء کے حالات، ماحول، مزاج ومنہاج اور شاعرانہ فکر واسلوب میں چونکہ فرق وامتیاز ہے، لہٰذا ان کے شعری اسلوب میں بھی تنوع دکھائی دیتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ کتاب کا یہ صحیفہ اُس پورے عہد کی فارسی شاعری کا ترجمان بن گیا ہے، جب فارسی کی پاکیزہ کلاسیکی شاعری اپنے منتہائے کمال پر تھی اور اسلوب میں یکسانیت کے باوجود شعراء کے کلام میں ایک طرف تنوع کا بھی احساس ہوتا ہے اور دوسری طرف مختلف اندازِ سخن کے جلوے بھی نظر آتے ہیں۔

'تحفہ سامی' کی تالیف ایک ایسے دور میں ہوئی جب فنِ تذکرہ نویسی کے اصول وضوابط بھی وضع نہیں ہوئے تھے اور نہ اس کی شعریات مرتب ہوئی تھی۔سام میرزا نے جب یہ تذکرہ ترتیب دینا شروع کیا تو شعراء کے زندگینامہ کی توقیت اس کی پہلی ترجیح تھی جس کو اُس نے نہایت جامعیت کے ساتھ اس انداز سے ترتیب دیا ہے کہ شعراء کے حالات کے ساتھ اُس پورے عہد کا سیاسی، سماجی، تہذیبی، معاشرتی، مذہبی اور صوفیانہ ماحول منعکس ہو کر سامنے آ گیا ہے۔دوسرے نمبر پر ان شعراء کی تخلیقات کا تجزیہ ہے، جس سے سام میرزا کے وسعتِ مطالعہ کے ساتھ اس کے ناقدانہ شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور آخر میں شعراء کے کلام کا انتخاب اور اس پر تبصرہ ہے جو نہ صرف ہر صنفِ شاعری پر سام میرزا کی گہری نگاہ کا پتہ دیتا ہے بلکہ اُس کا نفیس شاعرانہ ذوق اور اُس کی سخن فہمی بھی عیاں ہوتی ہے۔سام میرزا نے 'تحفہ سامی' لکھ کر فنِ تذکرہ نویسی کا گویا باضابطہ اصول متعین کر دیا ہے اور وہ بھی ایک ایسے دور میں جب فارسی ادب میں اس فن کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا۔بلا شبہ 'تحفہ سامی' نے مستقبل کے تذکرہ نگاروں کی راہ آسان کر دی ہے۔فکری اعتبار سے بھی اور اسلوبی لحاظ سے بھی۔اس کے علاوہ چونکہ سام میرزا نے اپنے بیانیہ کی بنیاد توازن اور حقیقت نگاری پر رکھی ہے لہٰذا اس کی یہ کتاب افراط وتفریط کا شکار ہونے سے بچ گئی ہے۔کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ یہ بہت مشہور شعر سام میرزا کا ہے :

حاصل عمر نثار رہ یاری کردم
شادم از زندگئی خویش کہ کاری کردم

اور کتنی عجیب بات ہے کہ یہ شعر سب سے زیادہ اگر کسی پر صادق آتا ہے تو وہ خود سام میرزا کی ذات گرامی اور

اس کی کتاب 'تحفہ سامی' ہے۔

تذکرہ 'تحفہ سامی' کے تعلق سے یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کی تدوین کے دوران، پروفیسر اقبال حسین صاحب نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے بھی مشورہ کیا تھا۔ اس کا انکشاف کرتے ہوئے خود پروفیسر اقبال صاحب نے ذاکر صاحب پر اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ پروفیسر براؤن کی کتاب 'تاریخ ادبیات ایران' میں ذاکر صاحب نے اس کتاب کے بارے میں پڑھا تھا۔ انہوں نے پروفیسر اقبال صاحب کو اس کی تدوین کی ترغیب دیتے ہوئے یہ مشورہ بھی دیا کہ تدوین متن کے دوران کوئی غلطی یا خامی نہ رہ جائے اور حواشی کے نوٹ کو زیادہ طول نہ دیا جائے۔ چنانچہ پروفیسر اقبال صاحب نے ان کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے اس کتاب کی تدوین کی اور اشاعت کے بعد اس کا نسخہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمت میں ارسال کیا اور بعد میں خود دلی جا کر ان سے ملاقات بھی کی۔ ذاکر صاحب نے اظہار مسرت کرتے ہوئے ،اقبال صاحب کے اس علمی کارنامے پر انہیں مبارکباد دی اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ پروفیسر اقبال صاحب نے اعتراف کیا ہے:

''یہ سب کچھ ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر ذاکر حسین) کے اچھے مشوروں کی بدولت ہوا۔''

(خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ۔شمارہ ۵۰۔۱۹۸۹ء ص ۱۱۹)

تذکرہ 'تحفہ سامی' کے بعد پروفیسر اقبال حسین کا ایک اور اہم تحقیقی کارنامہ ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء پر ان کا تحقیقی مقالہ ہے جو انہوں نے انگریزی میں اپنے استاد محترم ڈاکٹر عظیم الدین احمد کی نگرانی میں لکھا اور جس پر پٹنہ یونیورسٹی نے نہ صرف انہیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند سے نوازا بلکہ اس مقالے کو کتابی شکل میں شائع بھی کیا۔ بعد میں قاضی عبد الوارث صاحب نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو، اُس زمانے میں ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ میں انگریزی زبان و ادب کے استاد کی حیثیت سے مامور تھے۔ یہ ترجمہ بہار اردو اکادمی پٹنہ کے زیر اہتمام ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔

سات ابواب پر مشتمل اس کتاب میں اقبال صاحب نے ایک مخصوص عہد تک اپنی تحقیق مرکوز رکھی ہے۔ ۴۲۱ھ سے ۶۷۹ھ تک۔ تقریباً ڈھائی سو سال پر مشتمل یہ زمانہ، امیر خسرو سے پہلے کا زمانہ ہے جس میں چھ(۶) نمائندہ ہندوستانی شعرا ابھر کر سامنے آئے۔ نکتی، ابوالفرج رونی، مسعود سعد سلمان، تاج الدّین دہلوی، شہاب الدّین بدایونی اور عمید الدّین سنامی۔ پروفیسر اقبال صاحب نے کتاب کے پیش لفظ میں صحیح لکھا ہے کہ امیر خسرو کی آمد سے قبل تک کا یہ زمانہ ہندوستان میں فارسی شاعری کی ابتدا و ارتقا کے لحاظ سے بیحد اہم ہے جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ جبکہ ان کے مطالعہ کے بغیر مابعد ادوار کے شعر و ادب کو اس کے صحیح تناظر میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس دور کے بیشتر شعرا کا ذکر صرف قدیم تذکروں میں ملتا ہے اور ان میں بھی بیشتر تذکرے اب تک غیر مطبوعہ ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کے لئے بیشتر مواد بھی انہیں خدابخش لائبریری

میں محفوظ مخطوطات ہی سے حاصل ہوا۔ بعض شعرا کے بارے میں بہت کم اطلاعات دستیاب تھیں۔ پروفیسر اقبال صاحب نے ان کے کلام سے داخلی شواہد کی بنیاد پر ایسے شعرا کے بارے میں مزید تفصیلات فراہم کی ہیں جو، اُن کے مطالعہ کی وسعت اور گیرائی کا پتہ دیتا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں اُس عہد کے سیاسی وسماجی ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر اقبال صاحب نے سب سے پہلے غزنوی بادشاہوں کے اوصاف اور ان کے ادبی ذوق پر روشنی ڈالی ہے۔ سلاطین غزنی کو یہ ذوق سلطان محمود سے ورثہ میں ملا تھا اور اس روش کو برقرار رکھتے ہوئے انہوں نے ایک ایسا ادبی ماحول بنایا تھا جس سے متاثر ہو کر اس زمانے کے فارس، خراسان اور ماوراء النہر سے نامور شعرا وادبا ہجرت کر کے لاہور آ گئے تھے۔ اقبال صاحب کی تحقیق کے مطابق نکتی پہلا ہندوستانی شاعر تھا جس نے سلطان محمود کے بیٹے سلطان مسعود کے دور حکومت میں زندگی بسر کی۔ سلطان مسعود کے بعد بھی دیگر سلاطین مثلاً سلطان ابراہیم، سلطان مسعود بن ابراہیم، سلطان ارسلان شاہ اور سلطان بہرام شاہ نے بھی فارسی شعرا کی سرپرستی کی اپنے اجداد کی روایت کو برقرار رکھا جس کے نتیجہ میں ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان جیسے شعرا عالم وجود میں آئے۔ پروفیسر اقبال صاحب نے اپنے مختصر سے تعارف میں اس تاریخ کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے غزنویوں کے زوال اور غوریوں کے عروج کے ساتھ سلطان قطب الدّین کی تخت نشینی کا بھی ذکر کیا ہے جس کی دہلی آمد کے بعد لاہور کی ادبی مرکزیت گویا ختم ہوگئی تھی اور دہلی ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی تھی۔ اقبال صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سلطان التمش، رکن الدّین فیروز، ناصر الدّین محمود اور غیاث الدّین بلبن وغیرہ کا ذکر کیا ہے جن کے ادبی ذوق اور فیاضانہ سرپرستی کے سائے میں تاج الدّین دہلوی، شہاب الدّین بدایونی اور عمید الدّین سنامی جیسے شعرا کو شہرت اور ترقی نصیب ہوئی۔ اُس عہد کی تاریخ کے تناظر میں اقبال صاحب کا یہ تحقیقی بیانیہ دراصل اُس پس منظر پر روشنی ڈالتا ہے جس نے امیر خسرو کی شاعری کے لئے زمین ہموار کیا تھا۔ اقبال صاحب کی یہ نتیجہ خیزی بالکل صحیح ہے کہ ان متقدمین شعرائے فارسی پر گفتگو کے بغیر ہندوستان میں فارسی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

کتاب کا دوسرا باب نکتی لاہوری کے ذکر پر مشتمل ہے جس کے بارے میں بہت کم اطلاعات دستیاب ہیں۔ اقبال صاحب نے صرف عوفی کا ذکر کیا ہے جس کا تذکرہ 'لباب الالباب' نکتی کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کا غالباً واحد اور اہم ذریعہ ہے۔ بعد کے تذکرہ نگاروں نے بھی نکتی کے بارے میں اس کے بیانات کو ہی نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے جس میں تقی اوحدی بھی شامل ہے۔ تاہم اوحدی نے نکتی کے سلسلے میں اشتباہاً یہ دعوا کر کے کہ نکتی کا شمار سلطان مسعود بن ابراہیم کے ہمعصروں میں ہوتا ہے، ایک فاش غلطی کر دی تھی جس کی تردید کر کے اقبال صاحب نے تاریخ کے رکارڈ کو درست کر دیا ہے۔ اقبال صاحب نے داخلی شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ سلطان محمود کا بیٹا سلطان مسعود تھا، نہ کہ

سلطان مسعود بن ابراہیم، جونکتی کا معاصر تھا اور جس کی سرپرستی میں اس کو عروج حاصل ہوا۔انہوں نے نکتی کے کلام کی عدم دستیابی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اس کے مختصر سے دستیاب کلام کی روشنی میں ہی اس کے کلام کا فنی جائزہ لیا ہے اور بعد کے شعرا پر اس کے اثرات کی نشاندہی بھی کی ہے۔

کتاب کے تیسرے باب میں ابوالفرج رونی کے بارے میں بھی تذکرہ نگاروں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرتے ہوئے پروفیسر اقبال حسین نے تاریخی حقائق کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس کا وطن رون تھا جو اُس زمانے میں لاہور کے مضافات میں ایک قصبہ تھا۔جبکہ بعض تذکرہ نگار اس کے ایک ہمنام شاعر ابوالفرج سگزی کی وجہ سے اشتباہ کا شکار ہو گئے تھے۔اس سلسلے میں انہوں نے 'تاریخ فرشتہ' کی ایک عبارت بھی نقل کی ہے جس میں اس کے مصنف نے ابو الفرج کو نہ صرف سیستانی بتایا ہے بلکہ عنصری کو اس کا شاگرد بھی قرار دے دیا ہے۔ان اشتباہات کو دور کرتے ہوئے اقبال صاحب نے اُن تمام تذکرہ نگاروں کی آراء کو بھی جمع کیا ہے جنھوں نے رونی کو لاہور کا باشندہ قرار دیا ہے اور جن میں عوفی سرفہرست ہے۔اسی طرح ابوالفرج رونی کی حیات کے بارے میں بھی تذکرہ نگاروں کے اختلاف آراء کا محاکمہ کرتے ہوئے اقبال صاحب نے نہ صرف اس کی توقیت حیات ترتیب دی ہے بلکہ مستند حوالوں سے اُن الزامات کی بھی تردید کی ہے جو بعض تذکرہ نگاروں نے ابوالفرج رونی پر عائد کیا تھا کہ اُسی کے تعصب اور سازش کے سبب، مسعود سعد سلمان جیسے شاعر کو، سلطان مسعود نے قید میں ڈال دیا تھا۔

اس مضمون میں پروفیسر اقبال حسین بیک وقت محقق اور ناقد کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں کہ انہوں نے نہ صرف ابوالفرج رونی کے قصائد کا فکری وفنی تجزیہ کیا ہے بلکہ اُن سلاطین، وزراء اور امراء کی مختصر سوانح بھی بیان کی ہے جن کی مدح میں یہ قصائد کہے گئے ہیں۔ان میں سلطان ابراہیم، سلطان مسعود بن ابراہیم، سیف الدّولہ محمود، خواجہ منصور بن سعید اور عبدالحمید بن احمد وغیرہ شامل ہیں۔اس کے قصائد پر ناقدانہ گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر اقبال حسین نے سادگی، روانی اور برجستگی جیسے عناصر کی نشاندہی کی ہے اور اس اہم نکتہ کی بھی صراحت کی ہے کہ صنف قصیدہ جس ابہام، تصنع، نمود ونمائش اور فخر ومباہات کے اظہار کے لئے بدنام ہے وہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔رونی کے قصائد ان عیوب سے پاک ہیں۔اسی طرح ابوالفرج رونی کی رباعیات میں بھی جوش، حرارت، شیرینیت اور نغمگی جیسے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے اقبال صاحب نے اس امکان کا اظہار بھی کیا ہے کہ عین ممکن ہے کہ ابوالفرج رونی کی رباعیوں سے متاثر ہو کر ہی عمر خیام رباعی نگاری کی طرف مائل ہوا ہو، اس لئے کہ دونوں ہم عصر تھے اور عمر خیام کی وفات سے محض چند سال قبل ہی رونی کا انتقال ہوا تھا۔اقبال صاحب نے ابوالفرج رونی کی رباعیات کے جو نمونے درج کئے ہیں، ان کے مقابل میں عمر خیام کی رباعیوں کو رکھ کر دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ رونی کی رباعیاں فکری وفنی لحاظ سے عمر خیام کے فکر وفن

پر اثر انداز ہوئی ہیں۔

مسعود سعد سلمان پر کتاب کا چوتھا باب تقریباً پچاس صفحات پر مشتمل ہے جو مسعود سعد کے عہد اوراس کی حیات و خدمات کے ہر پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔حالانکہ اس کی حیات کے مختلف ادوار کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے اختلاف آراء کو بھی انہوں نے نقل کیا ہے، تاہم ترجیح انہوں نے اُن بیانات
کو دی ہے جن کی تصدیق شاعر کے اپنے اشعار سے ہوتی ہے ۔مسعود سعد سلمان کے دیوان اشعار کے حوالے سے یہ انکشاف کرتے ہوئے کہ عربی و فارسی
کے علاوہ وہ ہندوستانی میں بھی شعر کہتا تھا، اقبال صاحب نے یہ امکان ظاہر کیا ہے کہ بعید نہیں اگر اس کے انہی اشعار نے امیر خسرو کی ہندوی شاعری کے لئے خام مواد فراہم کیا ہو۔ اپنے استاد ابوالفرج رونی کی طرح ہی مسعود سعد سلمان بھی قصیدہ گوئی میں ماہر تھا۔ اقبال صاحب نے اس کے قصائد پر گفتگو کرتے ہوئے اس کو دوحصّوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلے وہ قصائد جو، اس نے گرفتاری سے قبل کہے اور جن میں جوش و ولولہ اور خوشی کا رنگ نمایاں ہے اور دوسرے وہ قصائد جو، اس نے قید سے رہائی حاصل کرنے کے بعد کہے اور جن میں حزن و ملال اور یاس کی کیفیت عیاں ہے ۔ یہ دونوں رنگ شاعر کے بدلتے ہوئے حالات کے زائیدہ ہیں ۔ بدقسمتی سے مسعود سعد سلمان کی زندگی کا قیمتی حصہ جیل میں گزرا تھا۔ قید و بند کے دوران لکھی گئی اس کی 'حبسیات' کو بھی اقبال صاحب نے موضوع گفتگو بنایا ہے اور خاقانی کی 'حبسیات' سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے اس کو زیادہ صریح، دلگداز اور متاثر کن قرار دیا ہے۔ آخر میں سلمان کی رباعی نگاری اور اس کی مثنوی نگاری پر بھی اقبال صاحب نے مختصراً روشنی ڈالی ہے، اگرچہ شاعری کی یہ اصناف مسعود سعد کی ادبی شخصیت کی شناخت اور اس کی شاعری کا حوالہ نہیں بن سکیں۔

کتاب کے پانچویں باب میں پروفیسر اقبال حسین نے تاج الدّین دہلوی کو گویا دریافت کیا ہے، جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے جبکہ یہ خالص ہندوستانی شاعر تھا۔ اس لئے کہ اُس کی پیدائش ایک ایسے وقت میں دہلی میں ہوئی تھی جب دہلی، لاہور کی بجائے، ادبی سرگرمیوں کا مرکز بن چکی تھی ۔ سلطان شمس الدّین التمش اور اس کے بیٹے سلطان رکن الدّین کے دور حکومت میں اس کو عروج حاصل ہوا ۔ ان دونوں سلاطین کی مدح میں تاج الدّین کے کئی قصائد ملتے ہیں۔ چونکہ وہ سفر و حضر میں بادشاہ کے ساتھ رہتا تھا، اس لئے اس کے قصائد میں تاریخی واقعات کا بیانیہ بھی ملتا ہے جس کی وجہ سے یہ قصائد تاریخی اہمیت کے حامل بن گئے ہیں۔ پروفیسر اقبال حسین نے اس امتیازی وصف کے ساتھ فنی اعتبار سے بھی تاج الدّین دہلوی کے قصائد میں حسن زبان اور نغمگی کی تحسین کی ہے۔ اقبال صاحب کے تنقیدی مطالعات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تاج الدّین دہلوی تک فارسی قصیدہ معنوی تراکیب کی پیچیدگیوں سے پاک تھا اور ابتدا میں

تشبیب کا حصّہ بھی سادہ وسلیس ہوا کرتا تھا۔

کتاب کے چھٹے باب میں تاج الدّین دہلوی ہی کی طرح شہاب الدّین بدایونی کو بھی پروفیسر اقبال صاحب نے گویا از سرِ نو دریافت کیا ہے جس کے بارے میں علامہ شبلی لکھ چکے تھے کہ وقت نے شہاب الدّین کو مٹا دیا ہے۔لیکن اقبال صاحب نے اس مٹے ہوئے نام کو ایک بار پھر سے زندہ کرتے ہوئے قصیدہ نگاری میں اس کی انفرادیت کو بھی اجالا ہے کہ اس نے اپنے دور کی روش کے برعکس پہلی بار قصیدہ نگاری میں تقدس اور تصوف کے رجحانات کو عام کیا اور اسی لئے اقبال صاحب نے بجا طور پر اس کو قصیدہ نگاری میں 'اپنے طرز کا موجد' قرار دیا ہے۔غالبًا یہی وجہ ہے کہ بادشاہوں اور امیروں کی مدح میں اس کے بہت کم قصائد ملتے ہیں۔

عمید الدّین سنامی، کتاب کے ساتویں باب میں شامل آخری شاعر ہے جس کو اقبال صاحب نے خسرو سے پہلے عروج حاصل کرنے والا 'آخری ہندوستانی شاعر' قرار دیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے اس شاعر کی بعض اولیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عمید نے اپنے زمانے کی عام روش قصیدہ نگاری سے آگے بڑھ کر غزل کی طرف توجہ کی جس سے اس کے کلام میں موسیقیت اور نغمگی پیدا ہوگئی ہے۔اس کی دوسری اولیات میں اقبال صاحب نے 'مناظرہ' کے عنوان سے لکھی گئی اس کی نظموں کو بھی شامل کیا ہے۔حالانکہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مناظرہ لکھنے والا پہلا شاعر اسدی طوسی ہے۔تاہم ہندوستانی شعرا میں اولیت کا سہرا عمید الدّین سنامی ہی کے سر ہے۔بعد ازاں دونوں کے مناظروں کا موازنہ کرتے ہوئے اقبال صاحب نے عمید الدّین سنامی کو اسدی طوسی کا ہمسر قرار دیا ہے۔قصیدہ نگاری، اگرچہ عمید کی شاعری کا شناسنامہ نہیں ہے، تاہم آخر میں اقبال صاحب نے اس کے قصائد کے خصائص پر بھی گفتگو کی ہے۔پروفیسر اقبال حسین صاحب کی یہ کتاب تاریخ ادبیات فارسی کا وہ گمشدہ باب ہے جو، اگر کشف نہ ہوتا تو ہندوستان کے فارسی ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی ۔اسی انفرادیت کی بنا پر ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس کتاب پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے محمود شیرانی کے حوالے سے یہ یادگار جملہ کہا تھا:

''اب کچھ عرصہ تک اس طرح کی کتاب نہیں لکھی جائے گی۔''

(خدا بخش لائبریری جرنل، پٹنہ۔شمارہ ۵۰۔۱۹۸۹ء ص ۱۲۰)

ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء پر اقبال حسین صاحب کی اس کتاب کو شایانِ شان شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔لیکن یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ اس سے پہلے اسی قسم کا ایک اہم علمی کارنامہ اقبال صاحب انجام دے چکے تھے ، جسے شہرت ومقبولیت تو کیا، اس کی اطلاع بھی لوگوں کو نہ ہوسکی۔ہندوستان کے قدیم فارسی شعراء کی طرح، بہار کے قدیم صوفی شعراء پر انگریزی میں اقبال صاحب کا یہ اہم علمی وادبی اور تحقیقی کارنامہ انگریزی کتاب " Bihar through

" the ages کی زینت بنا جو R.R.Diwakar کی ادارت میں پٹنہ سے پہلی بار ۱۹۵۹ء میں اور دوسری بار ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ پروفیسر اقبال حسین نے اس مقالے میں نہ صرف بہار کے قدیم صوفی شعراء مثلاً احمد چرمپوش، مظفر شمس بلخی، حسین نوشہ توحید اور احمد لنگر دریاؔ وغیرہ کے شاعرانہ مقام ومرتبہ سے بحث کی ہے بلکہ بہار میں صوفیانہ شاعری کے شاندار ماضی کو بھی اجالا ہے۔ واضح رہے کہ قاموسی نوعیت کی اس کتاب " Bihar through the ages " کے لئے فارسی ادبیات کے مصنفین کے پینل میں پروفیسر عبدالمنان بیدل اور پروفیسر فیاض الدین حیدر کے ساتھ پروفیسر اقبال حسین بھی شامل تھے۔ اقبال صاحب کا یہ کارنامہ علمی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتا، اگر پروفیسر طلحہ رضوی برق صاحب اپنے ایک مضمون بعنوان "Early sufi poets of Bihar" میں پروفیسر اقبال صاحب کے نام سے اس مضمون کا حوالہ نہیں دیتے اور کتاب " Bihar through the ages " سے اس مضمون کے اقتباسات نقل نہیں کرتے۔ انگریزی زبان میں لکھا گیا پروفیسر طلحہ رضوی برق صاحب کا یہ مضمون ان کی کتاب " Mysticism in our poetry" میں شامل ہے۔ (ملاحظہ ہو اس کتاب کا صفحہ نمبر ۶۱)

یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر اقبال حسین، فارسی زبان وادب کے استاد تھے اور انہوں نے شاید ہی کبھی اسلامیات کے موضوع پر خامہ فرسائی کی ہو۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ جدید انگریزی علوم سے آراستہ ہونے کے باوجود، ان کا علمی خانوادہ ہمیشہ سے مذہبی اور اسلامی مزاج اور رجحانات کا حامل رہا ہے اور نہ صرف علمی سطح پر اس خانوادے نے اسلامیات کو موضوع بنایا بلکہ اسلام کو اپنی عملی زندگی میں برت کر بھی دکھایا۔ اقبال حسین صاحب کے خانوادے کا یہ مقدس پہلو بھی پردۂ خفا میں ہی رہ جاتا اگر وہ اپنے والد احمد حسین صاحب کی کتاب 'چھ مقالے' ترتیب دے کر شائع نہ کرتے۔

کتاب 'چھ مقالے' جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، چھ مقالات پر مشتمل ہے۔ اسلامیات کے موضوع پر ان مقالات کے عنوانات یوں ہیں:

(۱) اسلام (۲) قرآن (۳) احکام قرآن (۴) توحید (۵) شرک (۶) پیغام حق

کتاب کا پیشگفتار اقبال حسین صاحب کے استاد گرامی اور فارسی کے معروف استاد پروفیسر عبدالمنان بیدل نے لکھا ہے اور اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ایک علیگ اور ایک ڈپٹی مجسٹریٹ ہونے کے باوجود کیسے انہوں نے یہ کتاب لکھ دی۔ اس کے بعد کتاب کا دیباچہ 'گزارش' کے عنوان کے تحت لکھتے ہوئے اقبال حسین صاحب نے پہلے اپنے والد اور اس کتاب کے مصنف احمد حسین صاحب کی سوانح حیات پر روشنی ڈالی ہے اور پھر اس کتاب کی وجہ تخلیق کے ساتھ اس کی ترتیب واشاعت کی داستان بیان کی ہے۔ اُن کے بقول، یہ کتاب اُن کے والد نے سر علی امام کو ان کے یوم پیدائش پر پیش کرنے کے لئے لکھی تھی۔ لیکن سر علی امام کی اچانک رحلت کے سبب اُن کی خواہش پوری نہ ہوسکی اور یہ کتاب غیر مطبوعہ رہ

گئی۔احمد حسین صاحب کی یہ علمی یادگار ضائع نہ ہو جائے، اِس خیال کے تحت اقبال حسین صاحب نے اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا۔

اپنی 'گزارش' میں اس کتاب کے مشتملات کے حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر اقبال حسین نے لکھا ہے کہ اس میں کسی عالمانہ یا فقیہانہ اسلوب کی جستجو نہ کی جائے کہ اس کا مصنف بی۔اے علیگ، ڈپٹی مجسٹریٹ اور ایک نہایت مصروف افسر تھا جس نے اسلام کے بنیادی اصولوں پر سادہ و سلیس انداز میں اپنے مافی الضمیر کو پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔تاہم اس سہل اور غیر مصنوع انداز نگارش میں تاثر کی جو بے پناہ شدت ہے، وہ اُن اقتباسات سے نمایاں ہوتی ہے جو اقبال صاحب نے بطور نمونہ اپنے دیباچہ میں درج کئے ہیں۔

پروفیسر اقبال صاحب کی تصنیفات میں ان کی کتاب 'قصائد عرفی' بقامت کہتر بقیمت بہتر کے مصداق ہے۔ نصابی نوعیت کی یہ کتاب عرفی کے دس قصائد پر مشتمل ہے، جس میں نعتیہ قصائد کے علاوہ مختلف امرا مثلاً میر ابوالفتح اور خانخاناں کی شان میں مدحیہ قصائد بھی شامل ہیں۔ پروفیسر اقبال صاحب نے چونکہ یہ کتاب ریاستی حکومت کی ہدایت پر درجہ اول کے فارسی کورس کے لئے ترتیب دی تھی ،لہذا انہوں نے صرف قصائد کا متن پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ان قصائد پر تبصرہ کرنے یا عرفی کی شخصیت اور اس کی شاعری کے حوالے سے کچھ لکھنا انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔غالباً پہلے کلاس کے بچوں کے لئے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔اس نصابی کتاب کی تالیف کا مقصد شاید فارسی شاعری سے طلبہ کو آشنا کرنا اور خاص طور پر فارسی قصائد کے رنگ و آہنگ کا ایک نمونہ پیش کرنا تھا۔

ان کتابوں کے علاوہ پروفیسر اقبال صاحب کی تصانیف کے ذیل میں دیوان چندر بھان برہمن کی ترتیب و تدوین کا ذکر بھی ملتا ہے۔تقریباً چالیس سال قبل ۱۴۰۶ھ میں 'پاسداران زبان وادبیات فارسی در ہند' کے نام سے ایک کتاب، خانہ فرہنگ ایران، نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔اس کتاب میں مرتب نے پروفیسر اقبال حسین صاحب کی تالیفات کے ذیل میں دیوان چندر بھان برہمن کی ترتیب کا ذکر یوں کیا ہے:

> " جمع آوری دیوان چندر بھان برہمن ،شاعر و نویسندۂ معاصر شاہجہاں " (ص ۱۱)

لیکن تلاش بسیار کے باوجود یہ کتاب مجھے دستیاب نہ ہو سکی۔خدا بخش لائبریری میں دیوان چندر بھان برہمن کے جتنے نسخے موجود ہیں، ان میں سے کوئی بھی نسخہ اقبال صاحب کا ترتیب دیا ہوا نہیں ہے۔اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ خود اقبال صاحب نے اپنی خودنوشت 'داستاں میری' میں اس کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے۔البتہ انہوں نے چندر بھان برہمن کی شخصیت اور اس کے کارناموں پر ایک مفصل مضمون ضرور لکھا ہے جو رسالہ 'معاصر' پٹنہ کے جنوری ۱۹۴۴ء کے

شمارے میں شائع ہوا ہے۔مضمون کی ابتداء میں اقبال صاحب نے فارسی ادب میں ہندوؤں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر عبداللہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے جنھوں نے اس موضوع پر پوری کتاب ہی لکھ دی ہے 'فارسی ادب میں ہندوؤں کا حصہ' کے نام سے۔اس کے بعد برہمن کے حالات زندگی کے بیان میں خود اس کی تصنیف 'چہار چمن' کو بنیادی ماٰخذ قرار دیتے ہوئے اقبال صاحب نے کئی ایسے غلط بیانات کی گرفت کی ہے جو برہمن کے حوالے سے مختلف تذکروں میں درج ہو گئے تھے۔مثلاً ایک بات یہ بھی مشتہر ہوگئی تھی کہ داراشکوہ کے قتل کے بعد برہمن نے کاشی میں اپنی زندگی کا بقیہ حصہ گوشۂ گمنامی میں بسر کیا۔اقبال صاحب نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اپنے سرپرست داراشکوہ کی موت کے بعد برہمن نے اورنگزیب کی ملازمت کر لی تھی۔لیکن چونکہ اُس وقت تک وہ ضعیف ہو چکا تھا اور اورنگزیب کی طرف سے اُسے خدشہ بھی رہتا تھا۔چنانچہ وہ اپنے وطن لاہور واپس چلا گیا اور وہاں مقبرۂ جہانگیر کی رکھوالی میں مصروف ہو گیا۔اس سلسلے میں خود برہمن کی تصنیف 'منشاٰت برہمن' کے حوالے سے اقبال صاحب نے برہمن کے کئی ایسے خطوط کا ذکر کیا ہے جو اس نے جہانگیر کے مقبرے میں اپنی خدمات کے بارے میں اورنگزیب کو لکھے تھے۔برہمن کی سوانح حیات کے ذیل میں ایسے نکات کا ذکر کم ملتا ہے جن کی طرف اقبال صاحب نے اشارہ کیا ہے۔اسی طرح اقبال صاحب نے برہمن کے بارے میں پھیلائی گئی اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا ہے کہ اس کے دل میں اسلام کے لئے نرم گوشہ تھا۔اس کے برعکس ،انہوں نے برہمن کے کئی ایسے اشعار کا حوالہ دیا ہے جس میں وہ اپنے ہندو برہمن ہونے پر فخر ومباہات کا اظہار کرتا ہے۔ اس مضمون کا نشان امتیاز یہ ہے کہ اقبال صاحب برہمن کے بارے میں تذکرہ نگاروں کی آراء پر آنکھ بند کر کے یقین نہیں کرتے۔یا وہ مختلف دلائل وشواہد کی بنیاد پر ان کی نفی کرتے ہیں یا پھر ان کے بیانات کا کوئی مستند ماٰخذ نہیں ملنے پر سوالیہ نشان ضرور لگاتے ہیں۔مثلاً 'نشترِ عشق' کے مصنف نے لکھ دیا کہ برہمن نے اپنے دیوان کے چند نفیس نسخوں کو ایرانی شعراء کے پاس اس درخواست کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنے ذوق کے مطابق اس میں سے اشعار منتخب کر دیں۔لیکن ایرانی شعراء نے مزین اوراق کو اپنے پاس رکھ کر باقی دیوان واپس کر دیا۔اقبال صاحب نے اس کی بھی تردید کرتے ہوئے خود برہمن کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جس میں اُس نے ایران میں اپنے اشعار اور اپنی دیگر تحریروں کی شہرت ومقبولیت کا ذکر کیا ہے۔

مضمون کے آخر میں برہمن کی تصنیفات کا ذکر کرتے ہوئے اقبال صاحب نے اس کے دیوان کے علاوہ خاص طور پر اس کی دو نثری کتابوں 'چہار چمن' اور 'منشاٰت برہمن' کی خصوصیات بیان کی ہیں۔یہ حصہ اقبال صاحب کی تنقیدی بصیرت کا اشاریہ ہے جس میں انہوں نے نہ صرف 'منشاٰت برہمن' کے خطوط کے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے، بلکہ اس کے اسلوب وانداز کا بھی ناقدانہ تجزیہ کیا ہے اور برہمن کے سادہ طرز تحریر کی تعریف کی ہے۔حالانکہ برہمن کے سامنے فارسی میں مرصّع نگاری کی ثروتمند روایت موجود تھی،لیکن وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر اپنی سادگی پر قائم رہا اور یہی اس کی انفرادیت

ہے۔شاعری میں برہمن کے امتیازات کواجالتے ہوئے اقبال صاحب نے خاص طور پراس کے متصوفانہ جذبات کی تحسین کی ہے۔فنی اعتبار سے برہمن کی شاعرانہ بندشوں اورتشبیہات واستعارات کے خوبصورت استعمال کوبھی انہوں نے سراہا ہے۔برہمن کےحوالے سےاقبال صاحب کا یہ مضمون ان کے تحقیقی مزاج اورتنقیدی میلان کاحسین امتزاج ہے۔

تصنیفات وتالیفات کےعلاوہ،ان کے مضامین ومقالات کے سلسلے میں ’بہار کی بہار‘(جلد دوم)میں ڈاکٹر اعجازعلی ارشد نے یہ جملہ لکھاہے:

> ’’اقبال حسین نے ہندوایرانی شاعروں پرکئی اہم مقالے لکھے جومختلف رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔‘‘ (ص ۱۵)

لیکن افسوس ہے کہ اعجازعلی ارشد صاحب نے نہ توکسی مقالے کاعنوان رموضوع لکھااورنہ ہی کسی رسالے کا نام لکھاجس میں، بقول ان کے، یہ مقالے شائع ہوئے ہیں۔میں نے اپنے طور پرتلاش کرنے کی کوشش کی توپروفیسر اقبال صاحب کا صرف ایک مضمون ڈاکٹر ذاکرحسین کےحوالے سے ملا جو’ڈاکٹر ذاکرحسین سے میری چند ملاقاتیں‘ کےعنوان سے خدابخش لائبریری جرنل، پٹنہ میں ۱۹۸۹ء میں شائع ہواہے۔یہ مضمون ذاکر صاحب کی علم دوستی اورادب نوازی کے ساتھ ان کے مطالعے کی وسعت اوران کے ناقدانہ ذہن کابھی پتہ دیتاہے۔ذاکرصاحب کی گورنری کے زمانے میں ڈاکٹر اقبال حسین کواکثر ان سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ان ملاقاتوں کے احوال میں انہوں نے ذاکرصاحب کے ظاہری اخلاق و کردار کے ساتھ ان کے باطنی اوصاف کوجس طرح اجالا ہے،وہ اقبال حسین صاحب کی اولیات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔

بہرحال تحقیق وتفتیش اورتلاش وجستجو میں کوئی بات حرف آخرنہیں ہوتی۔کوئی چیزنہیں ملی تواس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ موجودنہیں ہے۔جوکچھ دستیاب ہوسکا،وہ میں نے پیش کردیااورجوکچھ نہ مل سکا،اس کے بارے میں اپنی نارسائی کا اعتراف ہے۔امید ہے کہ آنے والے محققین، پروفیسر اقبال صاحب کی

وہ تخلیقات اورتحقیقی نگارشات بھی منظرعام پرلائیں گے،جن کی طرف ان کے سوانح نگاروں نے اشارے کئے ہیں اور جہاں تک میری رسائی نہ ہوسکی۔

منابع:

۱۔بہار کی بہار(جلد دوم)۔ڈاکٹر اعجازعلی ارشد۔ناشر،قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان،نئی دہلی۔اشاعت اول۔۲۰۱۷ء

۲۔داستاں میری(خودنوشت سوانح حیات)۔ڈاکٹر اقبال حسین۔ناشر،خدابخش لائبریری، پٹنہ۔اشاعت ثانی۔۲۰۰۰ء

۳۔چھ مقالے۔مصنف،احمدحسین۔مرتب،ڈاکٹر اقبال حسین۔ناشر،انجمن اشاعت دین،رمنہ روڈ، پٹنہ۔۱۹۷۱ء

۴۔ہندوستان کے قدیم فارسی شعرا۔مصنف،ڈاکٹر اقبال حسین۔مترجم،قاضی عبدالوارث۔ناشر،بہاراردواکادمی، پٹنہ۔۱۹۸۵ء

۵۔پاسداران زبان وادبیات فارسی در ہند۔تہیہ شدہ،مرکز تحقیقات زبان وادبیات فارسی در ہند،دہلی نو۔ناشر،خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، دہلی نو۔اشاعت اول۔۱۴۰۶ھ

۶۔تحفہ سامی (صحیفہ پنجم) مصنف،سام میرزا صفوی۔تصحیح وتدوین۔ڈاکٹر اقبال حسین۔ناشر،دارالفنون،پٹنہ۔۱۹۳۴ء

۷۔تحفہ سامی۔تالیف،سام میرزا صفوی۔تصحیح وتدوین۔وحید دستگردی۔ناشر،مطبع ارمغان،ایران۔۱۹۳۶ء

۸۔تحفہ سامی (قلمی) خدا بخش لائبریری،پٹنہ

۹۔قصائد عرفی۔مرتب،ڈاکٹر اقبال حسین۔ناشر،رام نرائن لال،الہ باد۔۱۹۴۸ء

۱۰۔خدا بخش لائبریری جرنل،پٹنہ۔شمارہ ۵۰۔۱۹۸۹ء

۱۱۔نشتر تحقیق۔ڈاکٹر سید شاہد اقبال۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی۔۲۰۱۶ء

۱۲۔رسالہ معاصر،پٹنہ۔مدیر: عظیم الدین احمد۔ جنوری ۱۹۴۴ء

13 . The Early Persian Poets of India (A.H. 421-679) By: Iqbal Husain. Patna Univerity, Patna. 1980

14. Mysticism in our poetry. Dr Talha Rizvi Barque. Danish Academy, Ara . 1984

15. Bihar through the ages. Editor, R.R. Diwakar. K.P Jayswal Research Institute, Patna. 2001

☆☆☆

اسماء
ریسرچ اسکالر،شعبہ عربی وفارسی
الہ آباد یونیورسٹی،الہ آباد

کوائف سلاطین گلبرگہ لب التواریخ کی روشنی میں

'لب التواریخ ہند' عہد اورنگزیب (۱۶۵۸ء۔۱۷۰۷ء) میں لکھی گئی ایک اہم تاریخ ہے جس کا مؤلف رای بندرابن ولد بھارامل ہے۔ بھارامل شاہجہاں کے منشیوں میں شامل تھا۔ اپنی ذہانت اور قوت عملی سے اس نے ترقی کی اور پنجاب کا گورنر مقرر کیا گیا۔ رای بندرابن کو ذہانت اور ذکاوت اپنے باپ سے ملی۔ عہد اورنگزیب کے ہندو امرا میں اسے بھی خاص اہمیت حاصل تھی۔ اسی کے قول کے مطابق ''عالمگیر اورنگ زیب نے اسے رای کا خطاب دیا اور معظم بہادر شاہ (۱۶۴۳ء۔۱۷۱۲ء) کی شہزادگی کے زمانے میں دیوان مقرر کیا۔''(۱) پروفیسر نورالحسن انصاری کے مطابق اس تاریخ کی اہمیت اس بنا پر مزید بڑھ جاتی ہے کہ ۱۰۹۵ھ میں جس وقت شاہ عالم نے دکن پر حملہ کیا تو مؤرخ رای بندرابن اس کے ہمراہ تھا۔''(۲) لب التواریخ کا ایک خطی نسخہ اسٹیٹ آرکائیوز، الہ آباد میں محفوظ ہے جس کا سیریل نمبر ۲۷۰ درج ہے۔ ۱۸۳۹ء میں اسے لکھا گیا اور اس کا کاتب جگت ابھے سہائے ہے۔ اس مضمون میں اسی خطی نسخے سے استفادہ کیا گیا ہے جسے آگے ن خ کی شکل میں درج کیا گیا ہے۔ رای بندرابن اس وقت کی رائج طرز تحریر کے مطابق لب التواریخ کا افتتاح بسم اللہ الرحمن الرحیم سے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا درج ذیل اشعار لکھتا ہے:

سبحان الله زهی خدائی متعال — عالی ز تصور است و مبرا از خیال
از نور لطافتش ضماہر مشحون — وز سر ترا هستی جهان ما لامال (۳)

لب التواریخ دس ابواب پر مشتمل ہے جو اس طرح ہیں۔

۱۔باب اول:۔ بادشاہان دہلی	۲۔باب دوم:۔ سلاطین دکن
۳۔باب سوم:۔ سلاطین گجرات	۴۔باب چہارم:۔ حکام مالوہ
۵۔باب پنجم:۔ خاندیس برہانپور	۶۔باب ششم:۔ حکام بنگالہ
۷۔باب ہفتم:۔ شرقیہ جونپور	۸۔باب ہشتم:۔ ترخانیہ سندہ
۹۔باب نہم:۔ سلاطین ملتان	۱۰۔باب دہم:۔ ملکان کشمیر

اس کے پہلے باب میں سلاطین دہلی کی تاریخ ہے جو شہاب الدین غوری (۱۱۷۳ء۔۱۲۰۲ء) کے عہد سے لیکر اورنگزیب کے ۳۴ویں سن جلوس ۱۶۹۱ء تک کے حالات پر مبنی ہے۔ اس میں دوسرا باب سلاطین دکن کی تاریخ سے متعلق مستند ماخذ فراہم کرتا ہے۔ مورخ نے دوسرے باب کو چھ شعبوں میں تقسیم کیا ہے اور ان میں مختلف بادشاہوں کا ذکر ان کے عہد حکومت کے لحاظ سے کیا ہے۔

شعبہ اول:۔ اس شعبہ میں حسن آباد اور گلبرگہ کے بادشاہوں کے حالات درج ہیں جو سلاطین بہمنی کے نام سے مشہور ہیں۔

شعبہ دوم:۔ اس شعبہ میں بیجاپور کے عادل شاہی حکمرانوں کی تفصیل ملتی ہے۔

شعبہ سوم:۔ اس شعبہ میں نظام شاہ شاہان احمد نگر کا ذکر کیا گیا ہے۔

شعبہ چہارم:۔ تلنگانہ کے فرمانرواؤں یعنی قطب شاہی خاندان کے احوال و کوائف کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

شعبہ پنجم:۔ اس شعبہ میں عمادشاہیہ برار کے احوال درج ہیں۔

شعبہ ششم:۔ اس شعبہ میں بیدر کے برید عمادشاہیہ کے حالات کی مندرج ہیں۔

لب التواریخ ہند کی دوسری فصل کے شعبہ دوم میں سب سے پہلے بہمنی خاندان کی تفصیل لکھی گئی ہے۔ سلطان محمد تغلق (۱۳۲۵ء۔۱۳۵۱ء) کے آخری زمانے میں دکن کے امیروں نے بغاوت کی تھی اور شاہی فوج کو بار بار شکست دے کر ۱۳۸۰ء میں حسن نامی ایک امیر کو علاء الدین کا خطاب دے کر بادشاہ بنایا تھا۔ (۴) یہ دور تقریباً چودھویں صدی کے نصف سے شروع ہوتا ہے۔ رای بندرابن کے مطابق یکے بعد دیگرے تقریباً دوسو سال تک اس خاندان کے اٹھارہ افراد بادشاہ ہوئے جن کے نام درج ذیل ہیں:۔

۱۔ سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمن	۱۳۴۷ء تا ۱۳۵۸ء
۲۔ سلطان محمد شاہ بن سلطان علاء الدین بہمنی	۱۳۵۸ء تا ۱۳۷۵ء
۳۔ سلطان مجاھد شاہ بن محمد شاہ بہمنی	۱۳۷۵ء تا ۱۳۷۸ء
۴۔ سلطان داؤد خان	۱۳۷۸ء
۵۔ سلطان علاء الدین گانگو بہمنی	۱۳۷۸ء تا ۱۳۹۷ء
۶۔ شلطان غیاث الدین بن محمود شاہ بہمنی	۱۳۹۷ء
۷۔ سلطان شمش الدین بن محمود شاہ بہمنی	۱۳۹۷ء

۸۔سلطان فیروز شاہ بن داؤد خان بہمنی	۱۳۹۷ءتا ۱۴۲۲ء
۹۔سلطان احمد شاہ بن داؤد خان برادر فیروز شاہ بہمنی	۱۴۲۲ءتا ۱۴۳۵ء
۱۰۔سلطان علاء الدین بن سلطان احمد شاہ بہمنی	۱۴۳۵ءتا ۱۴۵۸ء
۱۱۔ھمایوں شاہ ولد سلطان علاء الدین بہمنی	۱۴۵۸ءتا ۱۴۶۱ء
۱۲۔سلطان نظام شاہ بن ھمایوں شاہ بہمنی	۱۴۶۱ءتا ۱۴۶۳ء
۱۳۔سلطان محمد شاہ بن ھمایوں شاہ ظالم برادر	۱۴۶۳ءتا ۱۴۸۳ء
۱۴۔سلطان محمود بن محمد شاہ بہمنی	۱۴۸۳ءتا ۱۵۱۸ء
۱۵۔سلطان احمد شاہ بن محمود شاہ بہمنی	۱۵۱۸ءتا ۱۵۲۰ء
۱۶۔سلطان علاء الدین بن احمد شاہ بہمنی	۱۵۲۰ءتا ۱۵۲۳ء
۱۷۔ولی الدین بن سلطان محمود بہمنی	۱۵۲۳ءتا ۱۵۲۶ء
۱۸۔سلطان کلیم اللہ بن سلطان محمود بہمنی	۱۵۲۶ءتا ۱۵۳۸ء

دکن کی تہذیب وتمدن کوفروغ دینے میں سب سے اہم کردار بہمنی سلطنت کا رہا ہے۔بہمنیوں نے جب اس ملک میں اپنی سلطنت قائم کی تو یہاں کے مختلف علاقوں میں الگ الگ راجاؤں کی حکومتیں تھیں۔انھوں نے اپنی حکمت عملی سے مہاراشٹر ،کرناٹک اور تلنگانہ جیسے تین مختلف لسانی علاقوں، اور مخصوص تاریخی پس منظر کے حامل خطوّں کو ایک ہی سیاست اور حکومت کی لڑی میں پرو دیا۔(۵)اسماعیل فتح اور سلطان محمد تغلق کے درمیان جنگ ہوئی جس میں اسماعیل فتح کوشکست ہوئی۔جس کے بعد تمام امرا کی رای سے حسن گنگوہ بہمنی کو سلطان علاء الدین کا خطاب دیا گیا۔

”از ظفر خان یعنی حسن گانگوآثار شجاعت و مردانگی و همت و مخشش مکرر بظهور رسیده و بدفعات لشکر محمد شاه را بر شکست جمع امیران صد باتفاق اسماعیل فتح ،حسن گانگو بهمنی را سلطان علاء الدین خطاب کرده“(۶)

اس طرح علاء الدین بہمن کی تخت نشینی سے دکن کی مشہور بہمنی سلطنت کی بنیاد پڑتی ہے۔”علاء الدین حسن بہمن پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے برہمنوں کو اپنا شریک کار بنایا۔“(۷)

علاء الدین حسن بہمنی نے تخت نشینی کے بعد دولت آباد کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔اگر چہ اس نے اپنی حکومت کا ابتدائی حصّہ جنگ کرنے میں گزارا لیکن اس کے بعد اسے ثقافتی امور کی طرف توجہ دینے کا موقع بھی ملا۔اس نے حکیم نصر

الدین شیرازی، صدرالشریف جیسے بلند پایہ علما کو اپنے دارالسلطنت میں بلوایا اوران کی قدر دانی کی۔

علاءالدین بہمن شاہ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا محمد شاہ (۱۳۵۸ءتا۱۳۷۵ء) تخت پر بیٹھا شروع میں بیجانگر، تلنگ و کرنا تک میں سخت مخاصمت رہی۔محمد شاہ نے سلطنت کو چار صوبوں میں تقسیم کر دیا۔اخلاقی اصلاح کے لیے شراب نوشی بند کر دی اور ملک میں ایسا امن قائم کیا کہ لوگ عرصہ دراز تک یاد کرتے رہے۔

محمد شاہ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے مجاہد شاہ (۱۳۷۵ءتا۱۳۷۸ء) نے اپنی جسمانی قوت سے تخت اور شہرت پائی۔اس نے 'وجیانگر' کے راجہ کرشن رای حاکم کو ہر طرف سے گھیر کر محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا۔مجاہد شاہ نے امیر الامرا کو وجیانگر کے محاصرہ پر متعین کیا اور خود ملک میں داخل ہو کر سلطان پر چڑھائی کر دی مگر اس کے چچا داؤد شاہ نے اس کا قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔مجاہد شاہ کی ایک بہن تھی جس کا نام روح پرور تھا۔وہ اپنے بھائی کے خون کے انتقام کی فکر میں رہتی تھی آخر میں اس نے 'باکہ' نامی ایک نوکر کے ساتھ سازش رچ کر داؤد شاہ کو جمعہ کے وقت نماز میں قتل کرا دیا۔داؤد خان نے صرف ایک مہینہ پانچ روز حکومت کی۔

مجاہد شاہ کی کوئی اولاد نہ تھی بعض ارکان داؤد شاہ کے قتل کے بعد اس کے بیٹے محمد شاہ کو تخت سلطنت پر بٹھانا چاہتے تھے، مگر مجاہد شاہ کی بہن روح پرور نے کہا جس نے میرے بھائی کو قتل کیا اس کے بیٹے کو بادشاہ نہیں بنایا جاسکتا اور اس ہی کی کوشش سے محمود شاہ (۱۳۷۸ءتا۱۳۹۷ء) کو بہمنی سلطنت کا بادشاہ بنایا گیا۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہی خاندان کی عورتیں بھی کتنی بارسوخ ہوتی تھیں۔

رای بندرابن نے محمود شاہ کے عدل وانصاف کی بڑی تعریف کی ہے۔یہ صاحب علم اور علم دوست بادشاہ تو تھا ہی، ساتھ ساتھ خوش نویس اور شاعر بھی تھا۔قرآن شریف بھی اچھی طرح پڑھتا تھا۔اس بادشاہ سے منسوب یہ شعر لب التواریخ میں درج ہیں ملاحظہ ہو:

عاقبت در سینہ کار خون فاسد می کند
رخصتی ای دل کہ از الماس نشتر می خورم
خضر بد سوداست در بیع متاع عافیت
می روم این جنس را از جای دیگر می خورم(۸)

محمود شاہ مذہب کا بڑا پابند تھا۔اس کے زمانے میں کئی علما ایران سے گلبرگہ آئے۔محمود شاہ نے خواجہ حافظ شیرازی کو بھی پیغام بھیجا تھا، مگر خواجہ حافظ شیرازی نہ آسکے اور بادشاہ کے شکریہ میں ایک غزل ارسال کی۔جو لب التواریخ میں درج ہے۔

دمی باغم بسر بردن جهان یکسر نمی آرزد
بمی بفروش دلق ما کزین بهتر نمی آرزد
بس آسان می نمود اول غم دریا ببوی سود
غلط کردم که یك موجش بصد گوہر نمی آرزد(۹)

بادشاہ نے جب یہ غزل سنی تو سونے کے ہزار تنکے خواجہ حافظ کو شیری کو بھجوائے۔ محمود شاہ نے ۱۹ سال نو مہینے ۲۰ روز حکومت کی۔ بہمنی سلطنت کا یہ طویل زمانہ نہایت امن وعافیت کے ساتھ گزرا۔

محمود شاہ کے انتقال کے بعد غیاث الدین (۱۳۹۷ء) جو اس کا بڑا بیٹا تھا، سترہ سال کی عمر میں بادشاہ بنا۔ وہ اپنے والد کی ہی طرح رسم ورواج کا پابند تھا۔ وہ اپنے پرانے ملازموں کے ساتھ مل گیا اور سبھی اس سے مطمئن تھے۔ صرف ایک ماہ اور بیس روز کے لیے تخت بہمنی پر بیٹھا۔ تغلچین جو سلطان محمود شاہ کا ایک منہ لگا ترکی غلام تھا اس نے سلطان کی خدمت میں وزارت کی خواہش کی۔ غیاث الدین نے اس بنا پر اس کی خواہش سے انکار کر دیا کہ ایک غلام کو حاکم بنانا مناسب نہیں۔ تغلچین کی بڑی بیٹی خوبصورت اور ہندی فن موسیقی میں ماہر تھی اس نے سلطان کو اپنی جانب راغب کر لیا اور اسی کے ذریعہ سلطان کو ایک تنہا مقام پر دعوت دے کر بلایا اور وہاں اس کی آنکھیں نکال لیں، اور اس کو قید کر لیا ساتھ ہی ساتھ چوبیس مصاحبوں کو بھی قتل کر ڈالا۔

غیاث الدین کو معزول کر کے تغلچین نے اس کے چھوٹے بھائی کو بادشاہ بنایا جس کی عمر فقط پندرہ سال تھی اور خود ملک کا نائب وزیر بنا۔ جلد ہی اس کی کارروائیوں سے رعایا ناراض ہوگئی۔ دربار کے اراکین بھی مخالف ہوگئے اور انھوں نے فیروز خان کو رائے دی کہ تم بادشاہ سے امن حاصل کر کے گلبرگہ چلے آؤ۔ لوگ تمھارے موافق ہیں، اس رائے کے مطابق فیروز شاہ نے اپنی حکمت عملی سے تغلچین کو قید کر لیا۔

دوسرے بہمنی سلطانوں کے مقابلے میں فیروز شاہ (۱۳۹۷ء تا ۱۴۲۲ء) کا دور حکومت ہر اعتبار سے ترقی یافتہ خیال کیا جاتا ہے۔ فیروز شاہ علم وادب کا دلدادہ اور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ شراب نوشی اور استماع نغمہ میں مشغول رہتا تھا، اور کہتا تھے کہ نغمہ مجھکو یاد حق میں مشغول کرتا ہے اور شراب میرے نفس میں کوئی فساد پیدا نہیں کرتی جس سے اسے امید تھی کہ خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔ بندرابن نے درج ذیل خوبصورت اشعار اس سے منسوب کئے ہیں:

☆ کرشمہ جنبش آموزست مزگان د رازش را
ستم کردست واجب بر زبان تعلیم نازش را
بیای لذت ای زاہد ز وصلت از متاع خلد

همان بهتر که در امن کنی آخر نمازش را(۱۰)

☆در آتش هرزه فکر زائل نکنی

اندیشه بهر خیال مائل نکنی

این نقد خزینه دماغ است بگوش

تا صرف بجنس های باطل نکنی(۱۱)

آخر میں فیروز شاہ کو ایک بے جان حکمران دیورائے نے شکست دی اور مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ ۱۴۱۲ء میں سلطان فیروز شاہ نے اپنے بیٹے حسن خان کو ولیعہد بنایا تو سید محمد گیسو دراز جو گلبر گہ تشریف لائے ہوئے تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دعا کی درخواست کی۔ جس کے جواب میں حضرت نے فرمایا۔

"که سکه دولت بهمنه بنام احمد خان برادر توزده اند خواندن فاتحه تحصیل حاصل است اگر چه در وقت تشریف آوردن آن حضرت بگلبرگه لوازم اعزاز و احترام بجا آورده بودا ما بنا برتوجه بجانب معقولات اعتقادی بآنجناب اورانماند و احمد خان بر خلافت او رسوخ ارادت داشت و در دل فرق منزل آننجناب جا گرفته کرده بود"(۱۲)

فیروز شاہ نے حضرت سے ناخوش ہو کر کہا آپ قلعہ کے نزدیک رہتے ہیں اور لوگوں کا آنا جانا آپ کے یہاں لگا رہتا ہے لہٰذا آپ یہاں سے دور چلے جائیں۔ شیخ خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلے گئے۔ فیروز شاہ کے کہنے پر 'ہشیار عین الملک' اور 'نظام بیدار' جو غلام تھے، احمد شاہ کو قتل کرنے کا اشارہ کیا۔ احمد شاہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ اپنے بیٹے علاء الدین کو لے کر سید محمد گیسو دراز کی خدمت میں گیا اور وہاں سے چار سو جوانوں کو اپنے ساتھ لے جا کر ہشیار عین الملک اور بیدار نظام کا پیچھا کیا۔ فیروز شاہ پر شدت ضعف سے غشی طاری ہوگئی جس سے اس کے مرنے کا سہرہ تیار ہوگیا۔ اس کے تمام امرا احمد شاہ سے مل گئے۔ احمد خان نے قلعے کا محاصرہ کیا۔ آٹھویں شوال ۱۴۲۲ء میں فیروز شاہ کا ایجاد کیا ہوا تاج سر پر رکھا اور اپنے نام احمد شاہ کا خطبہ وسکہّ جاری کیا۔ فیروز شاہ کے آخری عہد حکومت میں دیورای نے مسلمانوں پر جو حملہ کیا تھا وہ سب احمد خان کو یاد تھا۔ جس پر سلطان احمد شاہ فتح حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ حکومت کے ۱۲ سال دو مہینے کی مدت میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑا کہ تمام کنویں اور دریا سوکھ گئے اور جنگلی جانور پانی کی کمی کی وجہ سے مرنے لگے۔ سلطان نے غلہ شاہی کا منھ کھول دیا لیکن دوسرے سال بھی یہی حال رہا۔ اس نے علما و مشائخ کو نماز استسقا کے لیے کہا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا لوگوں نے اس کو بھلا برا کہنا شروع کر دیا سلطان اس بات سے متاثر ہو کر جنگل کی طرف نکل پڑا بلند ٹیلہ پر چڑھ کر چند رکعت نماز

ادا کی اسی وقت بارش شروع ہوگئی۔اس ضمن میں ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ۔

بباریـد و خـنـدیـد بـاغ جهان گشت از سر چو روشن چراغ

همـه شهـر و ویـرانـه آبـاد شد شـاه از خـورمی شـاه شد(۱۳)

اس کے بعد رای بندرابن احمد شاہ کی درویشوں سے قربت اور شاہ ولی اللہ سے اس کی عقیدت کے بارے میں یوں رقم طراز ہے ۔

'بعد ازین سلطان باحمد شاه ولی ملقب گردید و احمد شاه همیشه طالب درویشان صاحب حال بود چون آوازه ارشاد و مقامات شاه نعمت اله ولی انتشار یافت سلطان جمعی از مردم خوب یا تحف و هدایای و افر بکرمان فرستاد تا بوکالت سلطان دست ارادت در دامن آن قطب زمان زده استدعای جمیت نمایند'(۱۴)

شاہ نعمت اللہ ولی نے احمد شاہ کے بھیجے تحفے کی قدر کی اور ایک سبز تاج بارہ گوشوں کا بنوا کر ایک صندوق میں رکھ کر ملا قطب الدین کرمانی کے حوالے کر دیا۔ملا جب دکن پہونچے تو بادشاہ کی نظر نے دور سے ہی دیکھ کر کہا کہ یہ تو وہی درویش ہیں جن کو میں نے سلطان فیروز شاہ کے جنگ کے زمانے میں خواب میں دیکھا تھا حالانکہ میں نے اس خواب کا ذکر کسی سے نہیں کیا۔ ملا نزدیک پہونچے سلام کیا اور نعمت الہ شاہ ولی کا یہ پیغام دیا کہ یہ تاج تمہاری امانت میرے پاس موجود تھی جس کے بارے میں لب التواریخ میں اس طرح درج ہے:

شـاه در هـنـد شیـخ در کـرمـان

تـاج بـخشـی چـنـیـن کـنـنـد شهـان (۱۵)

۱۲ سال دو مہینے حکومت کرنے کے بعد احمد شاہ کی وصیت کے مطابق اس کا بیٹا سلطان علاء الدین (۱۴۳۵ء تا ۱۴۵۷ء) احمد آباد بیدر کے تخت پر بیٹھا اور اس نے اپنے بھائی محمد خان کے سلسلے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔اسے فوج دے کر خراج کی وصولی کے لیے بھیج دیا۔اس نے اپنی پوری قوت کے ساتھ بیجانگر کے زمینداروں سے پانچ سالہ خراج وصول کیا جس سے گھبرا کر والی بیجانگر نے پچیس ہاتھی، آٹھ لاکھ دکنی اشرفی اور غلام لونڈی دیکر اپنی جان چھڑائی۔ کچھ بدمعاشوں نے محمد خان کو بہکانا شروع کر دیا جس کے نتیجے میں دو بھائیوں کے درمیان جنگ ہوگئی اور اس جنگ میں محمد شاہ کو شکست ہوئی۔سلطان علاء الدین نے واپس بیدر آکر محمد خان کو خط کے ذریعے بلایا۔۲۳ سال نو ماہ حکومت کے بعد علاء الدین شاہ کا انتقال ہوا۔اس کے بعد سلطان ہمایوں شاہ (۱۴۵۸ء تا ۱۴۶۱ء) جو ظالم کے نام سے مشہور ہوا تخت پر بیٹھا۔حکومت کے

تین سال چھ مہینے کی مدت میں سوائے ظلم وستم کے کچھ اور نہیں کیا رای بندرابن لکھتا ہے ۔

'تحریر آن سینه قلم بی مدد است شق شور و پیراهن کاغذ را آتش کرد لهذا از احوال او بهمین قدر اکتفا رفته'(۱۶)

اس کے ظلم وستم سے پریشان ہوکر حرم سرکے کے داروغہ خواجہ شہاب خان نامی نے حبشہ لونڈی سے سازش کر کے اسے قتل کروادیا۔ اس رات یہ خواب گاہ میں شراب کے نشے میں مدہوش تھا۔

ہمایوں شاہ کے قتل کے بعد سلطان نظام شاہ (۱۴۶۱ء تا ۱۴۶۳ء) جو اس کا بیٹا تھا، اور جس کا حسن وصباحت چاند اور سورج کے برابر دعوی رکھتا تھا، صرف آٹھ سال کی عمر میں دکن کے تخت پر بیٹھا۔ اس کی ماں مخدومہ جہان سلطنت کی ملکی و مالی حالات سے اچھی طرح واقف تھی۔ وہ خواجہ جہان و ملک التجار محمود گاواں کی مدد سے امور سلطنت کو انجام دیتی تھی۔ ان دونوں امیروں کے علاوہ سلطنت کے اندرونی معاملے میں کسی کو دخل نہ تھا۔ ہمایوں شاہ کے ظلم کی وجہ سے لوگ خوفزدہ تھے۔ جب لوگوں کو پتہ چلا کہ سلطنت ایک آٹھ سالہ بچے کے ہاتھ میں ہے تو ہر کوئی حکمرانی کرنے کا خواب دیکھنے لگا۔ والی اوریسہ اور رائی تلنگ راجاؤں نے غائبانہ نظر کر سلطنت کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ مخدومہ جہان نے اپنے دو امیر ارکان سلطنت کی مدد سے فوجوں کی فراہمی شروع کی اور جنگ کے لیے کوچ کیا۔ جس میں اوریسہ کو شکست ہوئی جس کے بدلے میں اوریسہ کے راجہ نے نظام شاہ کو پانچ لاکھ سکہ بطور جرمانہ ادا کیا۔ دو سال ایک مہینہ حکومت کے بعد ۱۴۶۳ء میں نظام شاہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے انتقال کے بعد سلطان محمد شاہ (۱۴۶۳ء تا ۱۴۸۳ء) نو سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا جو ہمایوں شاہ ظالم کا بیٹا اور نظام شاہ کا بھائی تھا۔ حکومت کے کاروبار ویسے ہی چل رہے تھے والدہ مخدومہ جہان اور خواجہ جہان ترک و ملک التجار محمود گاواں کی مدد سے۔ محمد شاہ کی تعلیم وتربیت پر بہت توجہ کی گئی۔ اسے حیدر خان ششتری کے حوالے کیا جو اپنے زمانے کے زبردست عالم اور پرہیزگار تھے۔ اس نے بہت جلد علم میں مہارت حاصل کر لی۔

فیروز شاہ کے بعد بہمنی سلطنت میں سلطان محمد کا دور ہر اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے دور میں ملک میں امن، سکون، آبادی، انصاف قائم ہوگیا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اسی سلطان پر بہمنی سلطنت کی خوبیوں کا خاتمہ بھی ہوگیا۔

سلطان محمد شاہ نے نظام الملک کو برار کے لشکر کا سردار مقرر کیا۔ قلعہ کھرلہ جو سلطان مالوہ کے قبضے میں تھا، فتح کرنے کے لیے روانہ کیا۔ جہاں پہونچ کر راجپوتوں کے ہاتھوں نظام الملک کا قتل ہوا۔ نظام الملک کے دو بھائی تھے، ایک یوسف خان دوسرا دریا خان۔ نظام الملک کا جنازہ لیکر بیدر پہونچے۔ سب کچھ بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا جس سے سلطان خوش ہوا اور ان دونوں کو ایک ہزاری امیر مقرر کر کے کھرلہ کا قلعہ کی جاگیر عطا کی۔ محمد شاہ کے عہد میں بہمنی سلطنت کی تمام خوبیوں کا خاتمہ ہوگیا۔ جس کے لئے بندرابن کا یہ شعر ملاحظہ ہو ۔

ھزار فتنہ زمی خیزد و عجب دارم
شراب را عرق فتنہ طون نمی گویند (۱۷)

سلطان محمود بن محمد شاہ (۱۴۸۳ء تا ۱۵۱۸ء) بارہ سال کی عمر میں تخت فیروز پر بیٹھا اور ۳۷ سال بہمنی سلطنت پر حکومت کی۔اس نے بہمنی سلطنت کا سب سے لمبہ عرصہ گزارا۔تخت نشینی کے وقت تمام درباری فخر الملک، دریا خان، عادل خان جو اس وقت پایہ تخت میں حاضر تھے۔ان سب نے بادشاہ سے بیعت کی۔اس کے بعد شاہ محبّ اللہ نے فاتحہ پڑھ کر سلطان محمد شاہ کی تاج پوشی کی۔محمود شاہ نے اسی تخت فیروز پر بیٹھ کر ترکوں اور مغلوں کو حکم دیا کہ دکنیوں اور حبشیوں کو موت کے گھاٹ اتارا جائے۔پورے تین دن تک قتل وغارت گری کا ہنگامہ رہا اور کسی شخص میں اتنی ہمت نہ تھی کی سلطان سے گزارش کرے۔آخر میں شاہ محبّ اللہ کے فرزند سلطان کے پاس حاضر ہوئے اور مجرموں کو معاف کردینے کی سفارش کی۔سلطان محمود نے ان کی بات مان لی۔محمود شاہ اور اس کا بیٹا احمد شاہ دونوں ہی غفلت کے عالم میں پڑے رہتے تھے۔ شراب ان کی زندگی کا لازمہ بن چکی تھی۔حکومت کے آخری سالوں میں سارے شہروں پر امیر برید کا قبضہ تھا۔اس کے بعد سلطان احمد شاہ نے (۱۵۱۸ء تا ۱۵۲۰ء) دوسال ایک مہینہ بہمنی سلطنت پر حکومت کی۔بعد اس کے علاء الدین بہمن (۱۵۲۰ء تا ۱۵۲۳ء)، ولی الدین بن سلطان محمود (۱۵۲۳ء تا ۱۵۲۶ء)، سلطان کلیم اللہ بن سلطان محمود (۱۵۲۶ء تا ۱۵۳۸ء) وغیرہ نے حکومت کی۔کلیم اللہ کے مرنے کے بعد بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور اسی شاخ سے پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں۔

حواشی

(۱) ن خ، لب التواریخ ہند، ص۔۱ (۲) فارسی ادب بعہد اورنگزیب، ص۲۷۴ (۳) ن خ، ص۔۱ (۴) ن خ، ص۔۹۸ (۵) دکنی ادب کی تاریخ، ص۔۹ (۶) ن خ، ص۔۹۸ (۷) سلاطین بہمنی ص۹ (۸) ن خ، ص۔۱۰۱
(۹) ایضا، ۱۰۱ (۱۰) ایضا، ۱۰۲ (۱۱) ایضا، ۱۰۲ (۱۲) ن خ، ص۔۱۰۵ (۱۳) ایضا، ۱۰۵
(۱۴) ایضا، ۱۰۵ (۱۵) ایضا، ۱۰۵ (۱۶) ایضا، ۱۰۶
(۱۷) ایضا، ۱۰۷

منابع وماخذ

۱۔نسخہ خطی لب التواریخ ھند، رای بندرابن، ،اسٹیٹ آرکائیوز الہ آباد، ۱۸۳۹ء
۲۔تاریخ فرشتہ، محمد قاسم ہندوشاہ فرشتہ، ترجمہ خواجہ ڈاکٹر عبدالرحمان، جلد دوم، دیوبند، ۲۰۰۹ء
۳۔فارسی ادب بعہد اورنگزیب، ڈاکٹر نورالحسن انصاری، انڈو پرشین سوسائٹی، دہلی، ۱۹۶۹ء
۴۔سلاطین بہمنی تاریخ دکن کا پہلا حصہ، خواجہ حسن نظامی، دہلی، ۱۹۲۵ء
۵۔دکنی ادب کی تاریخ، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۰ء

محمد رضا اظہری
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تذکرۂ بے نظیر؛ مولف اور قلمی نسخوں کا تعارف

ایران اور ہندوستان کے باہمی تعلقات صدیاں دور اور گہرے معاملات سے سرچشمہ لیتے ہیں. یہ باہمی تعلقات اس زمانہ سے شروع ہوتے ہیں جب ایران اور ہندوستان کے خاندانوں کے افراد ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر ایک نے ایران اور دوسرے نے ہندوستان کو اپنا مامن و مسکن بنالیا.اس کے بعد ہخا منشیوں کے دور حکومت میں ہندوستان کے شمالی علاقے ایران کے حدود میں شامل ہو گئے اور ساسانیوں کے دور تک اس شمولیتِ حدود کا سلسلہ برقرار رہا اور علمی و ثقافتی رشتوں میں بیش از پیش مضبوطی اور استحکام آ گیا جس کی بارز مثال برزویہ طبیب کا ہندوستان بیدپای نامی کتاب کی طلب جسے کلیلہ ودمنہ کے نام سے جانا جاتا ہے اس سرزمین پر آنا اس عظیم اور علمی وثقافتی رد و بدل کا سنہرا ورق ہے.

ایران کے بگڑتے ہوئے حالات کے پیش نظیر ہزاروں فارسی سخنور اور صاحب قلم دانشور، ہندوستان کے امن پرور اور علم دوست بادشاہوں کے دربار میں جوق در جوق کوچ کرتے رہے جن میں بہت سے ایسے چہرے ہیں جو آج فارسی آسمانِ ادب کے چمکتے ستارے ہیں.مسعود سعد سلمان، ابوالفرج رونی، سنایی غزنوی، نصر اللہ بن عبدالحمید، امیر خسرو، خواجہ حسن سجزی، عرفی، صائب، کلیم، طالب اور بیدل سے لے کر قریب کے گزرے ہوئے زمانے میں غالب دہلوی اور اقبال لاہوری اس سلسلۃ الذہب کی لڑیاں ہیں.

اگر اس خطے کے خاص طرز شعر گوئی جسے سبک ہندی کہا جاتا ہے، ماوراء ہو کر دیکھا جائے تو اس خطے کے فارسی نثر نگاروں نے بھی اپنے دو اہم پہلو نمایاں کئے ہیں: پہلا فارسی فرہنگ ولغت کی تالیف و تدوین میں تو دوسرا فارسی زبان شاعروں کے احوال واخبار کے ثبت میں. ایرانی مصنفوں اور نثر نگاروں نے بہ ذات خود دانستہ اور نادانستہ طور پر اس طرف شایان شان توجہ نہیں دی اور یہاں تک کہ ہندوستان اور پاکستان میں ہونے والی کوششوں اور مرحلہ ظہور میں آنے والے آثار سے بھی ناواقف رہے.

فارسی تذکرہ نویسی:

ساتویں صدی سے پہلے، شاعروں کے حالات زندگی اور ان کے اشعار کے نمونے پراگندہ طور پر بعض تاریخی

،جغرافیائی اور ادبی کتابوں جیسے چہار مقالہ نظامی عروضی (تالیف ۵۵۰ھ) اور آثار البلاد و اخبار العباد زکریای قزوینی (متوفی ۶۸۲ھ) میں ذکر ہوتے تھے.

فارسی کی اولین تذکرہ نامی کتابیں:

فارسی ادب کی وہ اولین کتابیں جن کے عنوان میں باقاعدہ تذکرہ نام کا ذکر ہوا ہے تذکرۃ الاولیاء عطار جس میں اولیا اور مشائخ کے احوال اور تصوف کے مباحث شامل ہیں اور نصیر الدین طوسی کی کتاب رسالہ آغاز و انجام معروف بہ تذکرہ، معاد کے مباحث پر مشتمل ہیں، سرفہرست ہیں. البتہ ان کتابوں میں لفظ تذکرہ کا معنی اس معنی و مفہوم میں جو آج فارسی نثری ادب میں مستعمل ہے استعمال نہیں ہوا ہے لیکن محمد طاہر نصر آبادی نے پہلی بار لفظ تذکرہ کو شاعروں کے شرح حال اور ان کے کلام کے نمونوں پر مبنی کتاب کو اپنی کتاب ''تذکرہ نصر آبادی'' میں استعمال کیا ہے.

ہندوستان میں فارسی تذکرہ نویسی کے ادوار:

ہندوستان میں فارسی تذکرہ نویسی کے ادوار کو پانچ حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے:

۱۔ساتویں صدی کی ابتدا میں مسلمانوں کی حکومت کے آغاز سے لے کر ۹۳۲ھ تیموریوں کی حکومت قائم ہونے تک.

۲۔ظہیر الدین محمد بابر کی ۹۳۲ھ میں ابتدائے حکومت سے لے کر ۱۰۶۸ھ میں شاہجہاں کی حکومت کے خاتمہ تک.

۳۔۱۰۶۸ھ میں اورنگ زیب کے دور حکومت سے لے کر ۱۲۷۴ھ میں برطانوی استیلا کے آغاز تک.

۴۔۱۲۷۴ھ میں سلطنت دورے سے لے کر ۱۳۴۹ھ تک.

۵۔۱۳۴۹ھ سے لے کر دور حاضر تک.

تیسرے دور کو مجموعی طور پر ۵۹ تذکروں پر مشتمل ہونے کے ناطے دیگر ادوار پر طرۂ امتیاز حاصل ہے. اس دور میں تخصصی فارسی تذکروں کا وجود میں آنا فارسی زبان و ادب کا ایک نیا باب تلقی ہوتا ہے.

تذکرۂ بے نظیر پر ایک طائرانہ نظر:

مصنف افتخار بخاری دولت آبادی کے احوال:

تمام منابع کی ورق گردانی کے بعد مصنف کا پورا نام مولانا میر سید عبدالوہاب افتخار بخاری دولت آبادی قرار پایا. اردو ذوق کے مالک ہونے کی وجہ سے اردو اشعار میں بیگل اور فارسی میں افتخار تخلص اختیار کرتے تھے. ان کے والد کا نام موجودہ دستاویزوں کے ذریعہ معلوم نہ ہو سکا مگر خود ان کی زبانی ان کے اجداد کا سلسلہ نسب جو برسوں پہلے ہندوستان کوچ کر کے سکنی پذیر ہوئے تھے اور بخاری سادات سے بھی تھے بالترتیب سید جلال الدین سرخ بخاری، سید احمد کبیر اور آخر میں مخدوم جہانیان سید جلال الدین حسین جہان گشت تک پہونچتا ہے. اگر چہ افتخار کی تاریخ پیدائش مفقود ہے مگر ان کی زبانی

وہ احمد نگر میں پیدا ہوئے. بچپن سے لے کر نوجوانی اور جوانی کے ایام تک گھر کے افراد کے سایہ تربیت میں پروان چڑھا اور فقہ، کلام، صرف ونحو، طب، فارسی وعربی ادب جیسے مختلف علوم وفنون میں مہارت حاصل کی اور ان سب کمالات کے ساتھ ساتھ اپنے والد سے فن خطاطی میں بھی کسب فیض کرتے رہے.

ایام شباب میں پہونچتے ہی ایک نا معلوم تاریخ میں مرتضی خان بخاری جو کہ دولت آباد قلعہ کے عمید تھے، ان کی بیٹی سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے، اور اس رشتے کے بعد ہی ایام حیات کے زیادہ تر حصے اسی شہر کے لیل ونہار میں گزار دی، اسی لئے زیادہ تر منابع وماخذ میں انھیں دولت آبادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے.

زندگی کے ایک نا مشخص ایام میں میر غلام علی آزاد بلگرامی سے افتخار آشنایی ہوئی اور یہی آشنائی انھیں فارسی نظم و نثر کی شاگردی وتلمذ تک لے گئی؛ مگر قرائن کے نقطہ نظر سے یہ آشنائی ید بیضا کے سال تالیف یعنی ۱۱۴۵ھ کے بعد ہی وقوع پذیر ہوئی ہے کیونکہ افتخار کے شرح حال ید بیضا میں قلم طراز نہیں! کچھ سالوں بعد یہ استاد اور شاگردی کا پیوند دوستی یاری کے رشتے میں تبدیل ہو گیا اور افتخار نے اپنے استاد اور دوست کی صلاح دید پر جن کی ملکی اور حکومتی نظم ونسق کے امور میں محکم گرفت اور بادشاہوں کے دربار میں اثر ورسوخ تھا، نواب نظام الدولہ ناصر جنگ والی حیدر آباد کی ملازمت اختیار کر لی اور خود ان کے قول کے مطابق رکاب کے حاضر باشی کے عہدے پر فائز تھے.

افتخار کے احوال کے مطالعے سے دیگر معلومات جو دستیاب ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اشجع الدولہ بہادر غیور جنگ جو کہ آصف جاہ نظام علی کے امرا میں سے تھے، خدمت کی ہے اور قیاسی طور پر اس خدمت کا سنہ ۱۱۸۲ھ بیان کیا گیا ہے. دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کا ایک مختصر حصہ یعنی سنہ ۱۱۵۶ھ میں تذکرہ تحفۃ الشعرا کے تالیف کے دوران ان کی زندگی عسرت اور پریشانی میں گزری ہے.

محبوب الزمن کے علاوہ دیگر تاریخی اور ادبی دستاویزوں نے، افتخار کی تدفین اور زمان ومکان دفن کے بارے میں خاموشی اختیار کی ہے. مذکورہ تذکرہ کے مولف نے بغیر حوالہ ذکر کئے افتخار کی سال وفات ۱۱۹۰ھ ذکر کرتے ہیں اور ان کے قبر کی نشاندہی حضرت برہان الدین غریبؒ کے جوار میں دولت آباد میں بیان کرتے ہیں.

افتخار دولت آبادی کے آثار وخدمات:

۱۔دیوان: افتخار کا دیوان جو کہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر مشتمل ایک جامع دیوان تھا، دستیاب نہیں لہٰذا ان سے منسوب جو بھی اشعار ہیں وہی ہیں جو تذکروں خاص کر تذکرۂ بے نظیر میں مرقوم ہیں.

۲۔تذکرۂ بے نظیر: اس تذکرے میں ۱۳۴ ہندوستانی اور ایرانی فارسی گو شاعروں کے احوال وآثار کا احاطہ کیا گیا ہے جو ۱۱۰۰ھ سے ۱۱۷۲ھ کے درمیان قید زیست میں تھے اور شاعروں کی ترتیب آزاد بلگرامی سے آغاز اور یوسف بلگرامی پر

اختتام پذیر ہوتی ہے.

۳-دقایق الاشعار: فہرستِ بادلیان میں دقائق الاشعار کا ایک نسخہ (نمبر۱۳۳۳) افتخار کی طرف نسبت دیا گیا ہے جس کی مایکروفیلم نمبر۹۰۰ کے تحت تہران یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری میں موجود ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ نسخہ جیسا کہ استاد محمد قزوینی، استاد مجتبیٰ مینوی اور احمد گلچین معانی بزرگ اساتید نے متفقہ علیہ فیصلہ کردیا ہے کہ یہ نسخہ درحقیقت ''مونس الاحرار فی دقائق الاشعار'' تالیف احمد بن محمد کلاتی کے تالیف کی دوسری صورت ہے، جس کے تیس موضوع بندی شدہ ابواب اور چوبیس باب رباعیات میں سے افسوس کے ساتھ صرف ۱۸ باب اور انتیسویں باب کے ابتدائی حصے کے علاوہ کچھ بھی باقی نہ رہا، نیز شروع اور آخر کے صفحات بھی ناپید ہیں، اسی لئے کوئی ایسا مسلم الثبوت اشارہ جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ اس نسخے کی تالیف کی بازگشت افتخار کی طرف نسبت دی جاسکتی ہے، شواہد اس سے محروم ہیں اور دوسری طرف جو بات اور باعث تشویش ہے وہ یہ ہے کہ فہرست بادلیان کے مولفوں نے بھی کوئی محکم دلیل اس انتساب کے تیئں بیان نہیں کی ہے. قیاسی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ افتخار اس نسخہ کے کاتب ہوسکتے ہیں، کیونکہ تذکرۂ بے نظیر کی بنا پر انھوں نے سالوں تک خط اور کتابت کی مشق بھی کی ہے.

تذکرۂ بے نظیر کی اہمیت اور افادیت:

۱-اس تذکرے میں ۱۳۴ ہندوستانی اور ایرانی فارسی گو شاعروں کے احوال و آثار کا احاطہ کیا گیا ہے جو ۱۱۰۰ھ سے ۱۱۷۲ھ کے درمیان قید زیست میں تھے اور شاعروں کی ترتیب آزاد بلگرامی سے آغاز اور یوسف بلگرامی پر اختتام پذیر ہوتی ہے.

۲-شاعروں کے احوال و آثار کے نقل کے علاوہ افتخار نے جگہ کی مناسبت اور اپنی صلاح دید کے مطابق اپنے بعض معاصرین کے اشعار اور تذکروں پر تنقید اور بحث بھی کی ہے اور اس طرح سے اپنی باریک بینی اور دقت نظر اور فکر وفن کی پختگی کا اظہار بھی کیا ہے. نمونے کے طور پر وارستۂ لاہوری کی تنقید جو اس نے افتخار کے استاد آزاد بلگرامی کے ید بیضا پر وارد کی ہے، وارستہ کے کچھ اغلاط کی نشاندہی کی ہے اور لکھتے ہیں: ''دراصل وارستہ کی ناکامی کی وجہ، ان کا دائرۂ اسلام سے خارج ہونا ہے. اسی طرح جہاں میر عبدالجلیل کی ایک رباعی کا ذکر کرتے ہیں وہیں احتیاط کے ساتھ حزین کی تالیف ''تذکرۃ المعاصرین'' کی تنقید بھی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں: شاید اس رباعی کو میر عبدالجلیل کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کی طرف نسبت دینے میں حزین نے غیر ثقہ پر اطمینان کرلیا ہے.''

۳-تذکرۂ بے نظیر واحد وہ منبع و ماخذ ہے جس میں تذکرۂ وارستۂ لاہوری کا ذکر ہے، وہ تذکرہ جس کا اب تک کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوسکا ہے.

۴-تذکرۂ بے نظیر واحد وہ منبع و ماخذ ہے جس میں حکیم الحکما باہر نامی شاعر کا ذکر ہے اور ان کے نمونہ کلام کو ذکر کیا گیا ہے.

۵-تذکرۂ بے نظیر واحد وہ منبع و ماخذ ہے جس میں نادر شاہنامہ یا شاہنامۂ نادری کے مولف یعنی عارف طہرانی کے احوال کا

ذکر ملتا ہے اور اسی بنیاد پر ثابت ہوتا ہے کہ اس کے مولف میرزا محمد علی عارف طہرانی ہے.

۶۔بہت سے ایسے دیوان جو افتخار کی نظر سے گزرے ہیں، ان کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہے یا پھر جو اشعار تذکرۂ بے نظیر میں کسی شاعر سے منسوب ہیں ان کے موجودہ یافت شدہ دیوان میں موجود نہیں.

۷۔تذکرہ کی اہمیت اور افادیت کے دیگر وجوہات میں سے افتخار کا اپنے استاد کے تئیں محبت ،عقیدت اور والہانہ انداز میں ان کے مقام کا ذکر بھی ہے .افتخار نے تمام تر احترام کے ساتھ اپنے استاد کی ان کے زمانۂ حیات میں مقبولیت اور محبوبیت کے ذکر کے ضمن میں ان کے آثار اور بعض اشعار کی تشریح اور ترجمہ بھی کیا ہے.

۸۔بعض منابع و مآخذ جن سے افتخار نے اپنے تذکرہ کے تہیہ و تکمیل میں ان سے استفادہ کیا ہے مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔تادیب الزندیق تالیف سید شاہ عبدالقادر معروف بہ مہربان اورنگ آبادی ۲۔دیوان آزاد بلگرامی ۳۔تذکرۂ وارستہ ٔ لاہوری ۴۔اخبار الاخیار تالیف شیخ عبد الحق محدث دہلوی ۵۔دیوان افصح مشہدی ۵۔دیوان خالص اصفہانی ۷۔تذکرۂ ہمیشہ بہار تالیف اخلاص شاہ جہان آبادی ۸۔تذکرۂ حیات الشعرا تالیف متین کشمیری ۹۔دیوان حزین لاہیجی ۱۰۔دیوان خالص اصفہانی ۱۱۔دیوان دردمند اودگیری ۱۲۔دیوان شوکت بخاری ۱۳۔مثنوی ہای شور جنون و نالۂ عاشق نواز از شہید لاہوری ۱۴۔دیوان شہرت شیرازی ۱۵۔مآثر الامرا تالیف صمصام الدولہ شاہ نواز خان ۱۶۔دیوان عالی شیرازی ۱۷۔تذکرۃ المعاصرین حزین لاہیجی ۱۸۔نادر شاہنامہ ٔ عارف طہرانی ۱۹۔دیوان سلونی سورتی ۲۰۔دیوان مخلص کاشانی ۲۱۔دیوان منصف دہلوی ۲۲۔ دیوان مظہر دہلوی ۲۳۔دیوان متین اصفہانی ۲۴۔دیوان نوید شاہ جہان آبادی ۲۵۔دیوان واضح دکنی ۲۶۔مثنوی ہای گلدستہ حسن و جہان آشوب از یکتا لاہوری.

تذکرۂ بے نظیر کے مختلف قلمی نسخوں کا تعارف:

۱۔ بنیادی نسخہ: وہ نسخہ ہے جو سالار جنگ حیدر آباد کی لائبریری اور میوزیم کے ذخائر میں محفوظ ہے .اس نسخہ کو بنیادی اور متن کا اساسی نسخہ منتخب کرنے کی وجہ تمام نسخوں کی طرح اس کی قدمت اور سال کتابت ہے .کیونکہ اس نسخہ کی انتہا میں واضح طور پر ''الحمدللہ نسخہ تذکرۂ بے نظیر بہ تحریر دہم شعبان المعظم روز جمعہ ۱۱۸۱ھ بہ اتمام رسید.'' کی عبارت مرقوم ہے اور اسی تاریخ کی بنیاد پر حتمی طور پرہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ مولف کے سال وفات یعنی ۱۱۹۰ھ کے وقوع پذیر ہونے تک موجودہ تمام نسخوں کے مقابلہ میں یہ نسخہ ایسا نسخہ ہے جو خود مولف کے قید حیات میں لکھا گیا ہے مگر اس بات کے بارے میں کوئی قطعیت نہیں کہ کیا اس نسخہ کو خود مولف نے لکھا ہے یا مولف کی نظر سے گزرا ہوا ہے؟ نسخہ کی تکمیلی معلومات میں یہ ہے کہ :نمبر شمار ۳۰۸۰ اور کیٹلاگ نمبر ۴۴ .MS.۵۵۸ کے عنوان کے تحت سالار جنگ لائبریری میں موجود ہے .اوراق کی تعداد ۸۵ اور ہر صفحہ پر ۱۵ سطروں کی تعداد کی رعایت کی گئی ہے .کچھ صفحوں کے علاوہ باقی صفحات بالکل صحیح اور مکمل ہیں اور استعمال شدہ خط بھی بالکل صاف اور خوانا ہے .کاتب نے علائم ،شعرا کے اسامی اور کچھ خاص مطالب کی نشاندہی کے لئے سرخ رنگ کا استعمال کیا ہے مگر افسوس کاتب کا نام ناپید ہے.

۲۔دوسرا نسخہ: وہ نسخہ جو محترم ایم۔نعیم الرحمان صاحب کی ذاتی لائبریری میں موجود ہے اور غلام عالم نامی کاتب کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔اس کتاب کے بارے میں منظور۔ایم۔علی صاحب نے مندرجہ ذیل اطلاعات کی فراہمی کی ہے:

اوراق کی تعداد ۸۲ اور ۱۵ سطروں کی تعداد کی رعایت کی گئی ہے۔متن کا سائز ۶×۲×۱۴×۱۱ اور ۱۰×۲×۱۴×۱۱ انچ اور صفحہ کی پیمائش کے بعد ۴×۱۱×۱۴×۱۱ اور ۸×۱۱×۱۴×۱۱ انچ کا سائز طے قرار پایا۔تحریر کی شکل شکستہ نستعلیق ہے اور سبھی عناوین اور علائم سرخ رنگ سے صفحۂ قرطاس پر مرحلۂ ظہور میں آئے ہیں۔کتاب کے پہلے صفحہ پر عنوان کا آغاز ایک پھولدار حاشیے کے ساتھ ہوتا ہے اور بعد کے صفحے پر فہرست مطالب کاتب کے علاوہ کسی غیر شخص کے ہاتھوں ترتیب دی گئی ہے۔اس نسخے کے اتمام کی تاریخ ۱۱۹۵ھ ہے۔جیسا کہ مذکورہ نسخہ کی عبارت سے مشہود ہے:

”تمام شد نسخه ی تذکره ی بی نظیر بعون الملك الوہاب الکبیر بید الفقیر غلام عالم بیوم الاحد من جمادی الاخیر فی سنة خمس و تسعین و ماته و الف عن ہجریة النبویه و علیه اکمل التحیات والسلام“

البتہ یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ راقم الحروف نے اس نسخہ کو بہ ذات خود نہیں دیکھا ہے۔

۳۔تیسرا نسخہ: یہ نسخہ مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں موجود ہے اور کچھ جہات سے مختصراً سالار جنگ نسخہ سے مشابہت بھی رکھتا ہے۔اس نسخے میں سال کتاب کا مسئلہ متنازع فیہ ہے کیونکہ دو جگہوں پر مختلف تواریخ کا ذکر ہے۔جہاں نسخے کی ابتدا میں:

”ہشتم ذی الحجه سنه سبع و خمسین و ماتین بعد الالف (۱۲۵۷) من ہجرة النبی صلّی اللّٰه علیه و آله وسلم یوم جمعه مقابله ی این نسخه آغازیده شد،تعالی شانه به طفیل حضرات علیهم الصلٰوة و السلام به انجام رِساند.تذکره ی افتخار دولت آبادی مسمی به بی نظیر.“

آیا ہے وہیں دوسری طرف نسخے کی انتہا میں” در ۱۲۴۹ فصلی نسخه ی افتخار آغاز شده و به تاریخ چهارم شهر ذی الحجه سنه مذکور از دست امتیاز علی اختتام پذیرفت.“ کی عبارت قید ہے۔البتہ تاریخی تضاد کے ساتھ بعید ہے کہ نسخے کے لکھنے میں آٹھ سال کا وقفہ پیش آیا ہو۔واللہ اعلم بالصواب۔

نسخہ کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتی ہے اور آیۂ کریمہ کے دونوں طرف رب یسر و تمم بالخیر کی عبارت آئی ہے۔کاتب نے اعراب اور علامتوں نیز شعرا کے اسامی کے لئے سرخ روشنائی کا انتخاب کیا ہے۔صفحوں کے پھٹے اور پرانے ہونے کی وجہ سے اکثر جگہوں پر سیاق و سباق کے ذریعہ قیاسی طور پر بھی عبارت کا پڑھنا مشکل ہے۔یہ نسخہ فارسیہ اخبار نمبر ۱۵۶ کے تحت لائبریری میں موجود ہے جس کے اوراق کی تعداد ۹۵ اور ۱۷ سطروں پر مشتمل ہے،نیز صفحہ کا سائز ۱۶×۲۴.۵ سینٹی مٹر اور متن کا سائز ۹×۱۹ سینٹی مٹر کے مقیاس پر منحصر ہے۔

۴۔ **چوتھا نسخہ:** یہ نسخہ بھی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری مولانا آزاد میں شمار نمبر ۳۹۶ ج ف کے تحت جواہر کلیکشن میں موجود ہے۔نسخہ کی ابتدا میں" تذکرہ ی بی نظیر به تاریخ بیستم شهر جمادی الاول ١٢٠٤ھ از خجسته بنیاد نزد اینجانب رسیده." کی عبارت موجود ہے مگر موصول کنندہ کا نام درج نہیں۔دوسرے صفحہ پر ایک مہر لگی ہوئی ہے کہ ''یہ کتاب مولوی محمد سعید ماہوی B.A کے بیٹے راشد احمد B.A.LL.B.M.A کے ہاتھوں مسلم یونیورسٹی کو اہدا کی گئی ہے۔لہٰذا اس مہر سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اہدا کے مرحلہ میں کتاب کس کی ملکیت میں رہی تھی۔کتاب کے صفحات خوبصورت حاشیہ سے منقش ہیں اور تمام متن میں کالی سیاہی مگر علامات اور شعرا کے اسامی کی نشاندہی سرخ رنگ سے ہوئی ہے۔اس نسخہ کے اوراق کی تعداد ۱۱۳، ہر صفحہ میں سطور کی تعداد ۱۵،صفحہ کا سائز ۱۴×۲۲ اور متن کا سائز ۱۰×۱۸ سینٹی مٹر ہے۔نسخہ کے ابتدائی صفحات صاف اور خوانا ہیں مگر آگے چل کر پھٹے اور بوسیدہ ہیں اور کچھ جگہوں پر متن کا فقدان ہے۔

۵۔ پانچواں اور آخری نسخہ نمبر شمار ۱۴۱۰ اوق و ۸ کے تحت آصفیہ لائبریری میں موجود ہے۔کاتب نے اپنے ذاتی ذوق کے مطابق نسخہ کی ابتدا میں حروف تہجی کے اعتبار سے شاعروں کی فہرست مرتب کی ہے اور تذکرہ کے متن کو ۳۰۷ اصفحات پر مشتمل کیا گیا ہے اور ہر صفحہ میں ۱۵ سطروں کی رعایت برقرار رکھی ہے اور دیگر نسخوں کی طرح اس نسخہ میں بھی عناوین اور شعرا کے نام سرخ رنگ سے مزین ہیں۔اگرچہ اس نسخے میں کتابت کی تاریخ کا ذکر نہیں مگر موجودہ قرائن کی بنیاد پر اصلی نسخہ سے زیادہ متاخر ہے۔املا کی بھرپور غلطیاں، جملوں میں کمی اور زیادتی اور الفاظ اور جملوں کی مفقودگی اس نسخے کی بارز خصوصیت ہے۔

ایک اور نسخہ جس کے بارے میں کسی کتاب میں معلومات فراہم نہیں ہوسکیں ہیں ۱۲۶۷ھ سے متعلق نسخہ ہے جس میں واضح طور پر یہ عبارت موجود ہے''کاتب الحروف محمد عبد الرزاق نقل نویس به تاریخ بیست و چهارم شوال سنه ١٢٦٧ھ به اختتام انجامید.''

منابع و مآخذ:

۱۔تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاک:علی رضا نقوی،چاپ علی اکبر علمی،تہران،۱۳۴۷ش،۱۹۶۸م

۲۔گل عجایب:ص ۱۵

۳۔تذکرہ بے نظیر

۴۔سرو آزاد:ص ۲۴۱

۵۔دانش نامۂ ادب فارسی در شبہ قارہ:ص ۲۳۱۵

۶۔خازن الشعرا:ص ۷۰۔

۷۔تاریخ تذکرہ ہائے فارسی: ج ۲،ص ۴۱۹

۸۔نشتر عشق:ص ۱۷۳

۹۔محبوب الزمن:صص ۸۷۳،۲۰۶

۱۰۔تحفۃ الشعرا: برگ ۹۷

☆☆☆

ڈاکٹر عالم اعظمی
شعبہ اردو
خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ

زبورِعجم پر ایک طائرانہ نظر

''زبورِعجم'' علامہ اقبالؔ کا چوتھا فارسی مجموعۂ کلام ہے۔ یہ چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دو حصوں میں غزلیں ہیں۔ پہلے حصے میں ایک اور دوسرے حصے میں دو انقلاب انگیز نظمیں بھی شامل ہیں۔ ''زبورِعجم'' کی غزلیں تغزل کا شاہکار ہیں۔ ان میں سرمستی و سرشاری، دلآویزی و شگفتگی اور وجد انگیزی و رعنائی اس اوج کمال پر پہنچ گئی ہے کہ ان کو دیکھنے میں بادی النظر میں حافظؔ شیرازی کے تغزل کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بلکہ یہ کہنا شاید بیجا نہ ہوگا کہ زبورِعجم کی غزلوں کے کیف و سرور کی نظیر حافظؔ کے علاوہ پوری فارسی میں مشکل ہی سے ملے گی۔ چنانچہ عبدالسلام ندوی کہتے ہیں: ''فارسی لٹریچر میں خواجہ حافظؔ کے جوش و مستی کا کوئی جواب ہوسکتا ہے تو وہ یہی چند غزل نما ترانے ہیں''۔

حصہ اول میں شاعر نے وفور شوق کی بے باکی اور ہجوم تمنا کی شوخی کے ساتھ حسن لم یزل کو مخاطب کیا ہے۔ اس خطابت کے جوش میں شاعر کا لہجہ کہیں بے لاگ اور بے باک ہوتا ہے تو کہیں مائل بہ عجز و انکسار بھی ہو جاتا ہے۔ وہ حسن حقیقی کو پردۂ مجاز میں دیکھنے کا متمنی ہے۔ اس کے دیدہ و دل وفورِ طلبِ نظارہ سے بیتاب و بیقرار ہو کر جذبۂ دید کی تسکین کے لیے ایک بت تراش لینے میں خود کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ بے بسی اور بے اختیاری کے جبر سے بالآخر شاعر کو گریہ و زاری کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ وہ جذبۂ دید کی شدت سے بیتاب ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ تو اپنے روئے زیبا سے نقاب الٹ دے کہ میں تیرے دیدار کے لیے خورشید سحر کی مانند لبریز نظر ہو کر آیا ہوں۔ صوفیائے کرام حسن فطرت کے پردے میں جلوۂ حسن ازل کا مشاہدہ کر لیتے ہیں لیکن شاعر کے معیار نظر پر حسن فطرت پورا نہیں اترتا۔ وہ حسن حقیقی سے کہتا ہے کہ تو کب تک اپنے چہرے پر شام و سحر کا پردہ ڈالے رہے گا۔ اب اپنے روئے روشن کو بے حجاب کر اور جلوۂ ناتمام کی تکمیل کر۔ لیکن دیدار حسن حقیقی کی تڑپ اور بیتابی شاعر کو ملت کے غم سے غافل نہیں کرتی۔ داخلی جذبات کی شدت میں بھی وہ ملت کے تئیں اپنے فریضے سے غافل نہیں ہوتا بلکہ اس کبوتر کے تن نازک میں شاہین کا جگر پیدا ہونے کی دعا کرتا ہے اور اس مقصد کے تحت خدا سے اپنی ملت ناتواں کی رہنمائی کی صلاحیت طلب کرتا ہے۔ شاعر دست بہ دعا ہے کہ خدا اسے توفیق دے کہ وہ اپنی آتش نوائی سے ایک طرف تو انسانوں کے قلوب تاریک کو منور کرے اور دوسری طرف فرشتوں کے دلوں کو

بھی پگھلائے وہ خدا سے اس کا کرم طلب کرتا ہے تا کہ اپنی مئے شبانہ سے چند جام اپنے ہم عصروں کو بھی عطا کر دے اور وہ بھی شاعر کی طرح قوت ایمانی کے حامل ہو سکیں۔اس حصے کا آخری اہم موضوع عشق ہے اور جس کا حامل معراج انسانیت حاصل کر لیتا ہے اس انسان کامل کو اقبالؔ نے اپنی ذات کے پردے میں پیش کیا ہے۔اور اس موضوع پر حصۂ اول اختتام پذیر ہوتا ہے۔ایک نظم اور 55 غزلیں ہیں۔

''زبورِ عجم'' کا دوسرا حصہ بھی غزلیات پر مشتمل ہے۔تاہم اس میں تین نظمیں بھی شامل ہیں۔ پہلے حصے میں خطاب خدا سے تھا اور اس حصے میں انسان علامہ کا مخاطب ہے۔اس میں انھوں نے عظمت انسان کے ترانے گائے ہیں لیکن پہلے حصے کی آخری غزل سے ہی اس مضمون کا آغاز ہو چکا تھا۔اس طرح وہ غزل دوسرے حصے کی تمہید کہی جاسکتی ہے۔حصۂ دوم کا آغاز بڑے پُر جوش انداز میں ہوتا ہے اور اس کے پہلے ہی شعر میں علامہ انسان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو شاخ نہال سدرہ ہے لہذا اپنے مقام و مرتبہ سے غافل ہو کر خود کو خار و خس میں تبدیل نہ کر۔اگر تو ذات خداوندی کا منکر ہو گیا ہے تو کم سے کم اپنے وجود سے انکار نہ کر، عشق کی بدولت ایک عاشق صادق اور انسان کامل سدرۃ المنتہی تک رسائی حاصل کر لیتا ہے لیکن ملائکہ کے سردار حضرت جبریل نوری ہونے کے باوجود اس شرف سے محروم رہتے ہیں۔شاعر انسان سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اٹھ اور خواب غفلت سے بیدار ہو۔تو وہ مشت غبار ہے جس کے سامنے ستارے سجدہ ریز ہوتے ہیں تو ایک دن ستاروں کو مسخر کرنے والا ہے۔وہ راز جو تخلیق آدم سے پہلے ضمیر کائنات میں پوشیدہ تھا، آج آدم کی زبان پر آ گیا ہے۔یہ پوشیدہ راز خود آدم تھا جس نے اپنی قوت تسخیر سے کائنات کے راز کو فاش کر دیا۔علامہ انسان کو اس کا مقام و مرتبہ یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنے چہرے سے پردہ ہٹا کر دیکھ کہ وہ ذات جس نے کبھی تیری ''رَبِّ اَرِنِـــی'' (اے میرے رب مجھے اپنا دیدار کرا) کے جواب میں ''لَنْ تَرَانِیْ'' (تو مجھے نہیں دیکھ سکتا) کہا تھا آج خود تیرے جلووں کی منتظر ہے۔خدا خود ایسے انسان کامل کا منتظر ہے جو ''اَحْسَنِ تَـقْوِیْم '' کی تعریف پر پورا اترتا ہو اور ''خَـلِیْـفَۃُ اللّٰـہِ فِی الأرْض '' کے شایان شان ہو۔

اس حصے کا ایک اور موضوع مغرب کا فکر و فلسفہ اور وہاں کا نظام سیاست ہے جس کی بنیاد محض مادی ترقی پر قائم ہے۔ مغرب کے دانش کدے اقبالؔ کے خیال میں روحانی اور اخلاقی اقدار سے خالی ہیں۔ان اقدار کا فقدان مغرب کے بقائے انسانیت اور احترام آدمیت جیسے دعووں کی نفی کرتا ہے۔شاعر کے مطابق مغرب کی اس ظاہری چکا چوند کا باطن تاریکی سے پُر ہے اور اس تاریکی کے سبب مغربی مفکرین صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں۔ یہاں تک کہ مغربی تعلیم گاہوں سے تحصیل علم نے خود شاعر کے افکار و نظریات کو بھی تاریک کر دیا ہے لہذا وہ بارگاہ ایزدی سے ایسی نگاہ کا طالب ہے جو راہ راست کی طرف اس کی رہنمائی کر سکے۔مغرب کے نظریۂ فکر و فلسفہ پر علامہ کی تنقید کہیں کہیں انتہائی شدید ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ

وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ مغربی مفکرین نے علم وعرفان کے تمام چشموں کو گندہ کر دیا ہے۔خواہ وہ ارسطوئی نظریات ہوں یا افلاطونی مفروضات دونوں دانش برہانی کے سبب حیرت کی فراوانی کے شکار اور دانش نورانی سے محروم ہوگئے ہیں۔مغربی علم و ہنر کا آفتاب انوار سحر سے خالی ہے۔علامہ کے خیال میں مادہ پرستی نے اہل مغرب کے قلوب کو سخت اور جذبۂ رحم سے بیگانہ کر دیا ہے۔لہٰذا وہ محکوم ومظلوم اقوام کو خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حاکم وظالم قومیں ناداروں اور مجبوروں پر ہرگز ترس نہیں کھاتیں۔باز اپنے پنجے میں دبے ہوئے پرندے کی فریاد پر دل گداختہ نہیں ہوتا۔شاعر مشرق نے محسوس کیا کہ مشرقی اقوام کی بیداری کے لیے غزل کے چیدہ چیدہ اشعار کے ذریعہ رموز وعلائم کے پردے میں شعلہ نوائی شاید کافی نہیں ہے بلکہ ان کے پژمردہ وافسردہ اذہان وقلوب میں حرکت وعمل کی چنگاریاں بھرنے کے لیے براہ راست مخاطبت کی ضرورت ہے۔لہٰذا انھوں نے اس مقصد کے تحت نظم کا سہارا لیا اور اپنے انقلاب انگیز خیالات کو انتہائی اثر انگیز اور دلنشیں انداز میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ جن نظموں میں یہ انقلابی خیالات پیش کئے گئے ہیں ان کی ہیئت اور ڈکشن بجائے خود بہت ولولہ انگیز ہیں۔یہ نظمیں ''یا چناں کن یا چنیں''، ''ازخواب گراں خواب گراں خواب گراں خیز''، ''انقلاب! انقلاب!'' جیسے انقلاب آمیز اور ولولہ انگیز مصرعوں کی تکرار سے انتہائی زور وشور کی حامل ہوگئی ہیں۔حصہ دوم کی آخری غزل میں شاعر نے اشرف المخلوقات سے ہی نہیں بلکہ پوری کائنات سے بیزاری ظاہر کی ہے۔وہ کہتا ہے کہ اب نہ عرب عرب رہا نہ عجم عجم، نہ گل ولالہ میں رنگ حقیقی باقی رہا اور نہ نالہ ہائے مرغان چمن میں پہلے کا ساز یروبم۔شاعر موجودہ کائنات سے یہاں تک بیزار ہے کہ اسے لگتا ہے کہ ملک عدم میں بھی کوئی نقش باقی نہیں ورنہ اس کارگاہ میں کوئی نیا نقش ضرور ابھرتا۔یہاں تک کہ آسمان کے سیاروں میں بھی ذوق انقلاب مر چکا ہے اور وہ اپنی گردش سے محروم ہوگئے ہیں۔یہ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ لوگوں کے دلوں سے فکر منزل رخصت ہوگئی ہے۔وہ راستے ہی میں سوگئے اور منزل کی طلب میں ان کے قدم نہیں اٹھتے۔شاید ان کے سینوں میں دم باقی نہیں رہا۔آخری شعر میں شاعر یہاں تک کہہ اٹھتا ہے کہ ان نامساعد حالات کا سبب یہی ہے کہ یا تو بیاض امکاں میں ایک بھی ورق سادہ نہیں بچا جس پر کوئی نئی بات لکھی جائے یا پھر خامۂ قدر وقضا سے تاب رقم رخصت ہوگئی ہے۔انھیں خیالات پر حصۂ دوم کا اختتام ہوتا ہے۔اس حصے میں غزلوں اور نظموں کی کل تعداد پچھتر (75) ہے۔

''زبور عجم'' کا تیسرا حصہ ایک مختصر مثنوی ''گلشن راز جدید'' پر مشتمل ہے۔یہ مثنوی شیخ سعدالدین محمود شبستری (وفات 720ھ) کی منظوم فارسی تصنیف ''گلشن راز'' کے جواب میں لکھی گئی ہے۔محمود شبستری ایران کے شہر تبریز کے قریب شبستر نامی قصبے کے باشندے تھے اور اس مناسبت سے محمود شبستری کی حیثیت سے شہرت پائی۔وہ ایک عارف کامل تھے۔ایک مرتبہ خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے ایک مرید امیر الحسینی نے شیخ کی خدمت میں پندرہ منظوم سوالات لکھ کر بھیجے اور

درخواست کی کہ ان کے جواب شافی مرحمت فرمائیں۔ شیخ نے ان سوالات کے جواب ''گلشن راز'' کی شکل میں دیے جو کم وبیش ایک ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔ ''گلشن راز'' رموز تصوف کی بہت معتبر تفسیر ہے۔ اس تصنیف کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے مستشرقین کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کی ہے۔ ڈاکٹر پرگستال نے جرمن زبان میں اس کا مکمل منظوم ترجمہ کیا جو 1838ء میں شائع ہوا۔ ای- وائن فیلڈ نے اسے ترجمے اور حواشی کے ساتھ 1880ء میں لندن سے شائع کیا۔ علامہ اقبال نے بھی اس مثنوی کی اہمیت وافادیت کو محسوس کیا اور اسی بحر میں امیر الحسینی کے سوالات کا جواب لکھا۔ اور اسے ''گلشن راز جدید'' کے نام سے موسوم کیا۔ علامہ نے ان پندرہ سوالات میں نو سوالات کو منتخب کر کے ان کا جواب لکھا ہے لیکن ان سوالات میں باقی سوالات کے مضامین کا بھی ضمناً احاطہ کر لیا گیا ہے۔

پہلا سوال:۔ تفکر کیا ہے؟ جس کے ذریعے راہ سلوک طے کی جا سکتی ہے اور یہ فکر کبھی طاعت اور کبھی گناہ کیسے ہو جاتی ہے؟

اس سوال کا جواب علامہ نے 134 اشعار میں دیا ہے۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ فکر خودی کی ایک حرکت ہے۔ اور خودی صفات خداوندی کا پرتو ہے لہذا اسے نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ راہِ سلوک طے کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سالک انفس و آفاق پر نظر رکھے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اپنی ذات پر قابو حاصل کرے۔ اپنے آپ کو مسخر کرے اس کے بعد کائنات کی تسخیر ممکن ہو جائے گی۔ تسخیر ذات معرفت ذات کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ اپنی معرفت حاصل کرنے کے بعد سالک منزل تفکر پر آ جاتا ہے جہاں وہ آفاق کو مسخر کر لیتا ہے۔

دوسرا سوال:۔ یہ سمندر کیا ہے جس کا ساحل علم ہے اور اس کی گہرائی سے کون سا موتی حاصل ہوتا ہے؟

اس سوال کے جواب میں بھی علامہ نے تین بند لکھے ہیں جن کا مضمون 128 اشعار پر مشتمل ہے۔ دوسرے سوال کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا اور خودی میں بحر اور موج کا رشتہ ہے۔ جس طرح موج بحر کا عکس ہے اسی طرح خودی خدا کا مظہر ہے۔ کائنات کا وجود ہمارے نفس کے ادراک پر منحصر ہے۔ اگر وہ کائنات کی اشیا کا ادراک حاصل نہ کرے تو اس کا وجود اور عدم برابر ہے۔ تاہم ترکِ کائنات آداب تصوف کے مغائر اور اس سے کسب فیض آداب تصوف کے مطابق ہے۔ لہٰذا سالک کو چاہئے کہ وہ کائنات کے آئینے میں جھانک کر کثرت میں وحدت اور خودی میں خدا کا مشاہدہ کرے اور اس حقیقت کے عرفان وادراک کے بعد کہ وہ (سالک) مادی نہیں، نوری ہے، اسے اپنی نوری قوت سے زمان ومکاں پر کمند ڈالنی چاہئے۔

تیسرا سوال:۔ ممکن اور واجب کا باہمی وصال کیا ہے؟ اور قرب وبعد اور بیش وکم کیا شے ہے؟

اس سوال کا جواب 137 اشعار پر محیط ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس دنیا کا وجود حقیقی نہیں، اعتباری ہے۔ لہٰذا

ہمیں اس کے وجود کے فریب میں نہیں آنا چاہئے اور صرف وجود حقیقی کی تلاش جاری رکھنی چاہئے۔اس کا سراغ اپنے من میں ڈوب کر ہی لگایا جاسکتا ہے۔چونکہ کائنات کی ہر شے صفات خداوندی کی مظہر ہے اس لیے جان و بدن اور روح و مادہ میں دوئی نہیں بلکہ وحدت ہے۔دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزم ہیں۔اگر ان میں دوئی ہوجائے تو نہایت خطرناک نتائج سامنے آتے ہیں۔عقل مجبور محض ہے لہذا اس سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہئے اور عشق کا دامن تھام لینا چاہئے۔

چوتھا سوال:-قدیم و محدث کیسے جدا ہوگئے کہ ایک عالم اور دوسرا خدا ہوگیا۔اگر معروف و عارف خدا کی ذات پاک ہی ہے تو پھر اس مشت خاک کے سر میں کیا سودا سمایا ہوا ہے؟

اس سوال کے جواب میں علامہ نے دو بند نذر قلم کیے ہیں جن کے اشعار کی تعداد تیس (30) ہے۔ان اشعار کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ قدیم اور حادث میں حقیقت کے اعتبار سے نہیں بلکہ تعین کے اعتبار سے فرق ہے۔حادث کے آئینے میں جلوۂ قدیم ہی عکس بار ہے۔حسن ازل نے اپنے دیدار کے لیے آئینۂ کائنات پیدا کیا ہے۔اس لیے عرفان خودی عرفان خدا سے عبارت ہے۔چونکہ کائنات کے آئینے میں خالق کائنات کا عکس ہے لہذا ہر شے (بشمول انسان) کی خودی اپنے اصل (خدا) سے ملنے کے لیے بے قرار ہے۔

پانچواں سوال:-میں کون ہوں؟ مجھے ''من'' سے واقفیت عطا کر اور ''اپنے اندر سفر کرنے'' کے کیا معنی ہیں؟

پانچویں سوال کا جواب بھی تیس (30) اشعار پر محیط ہے۔اس سوال کا جواب دیتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ وجود مطلق کا تعین ہی ''من'' ہے اور ''سفر در خویش'' سے مراد والدین کے بغیر دوبارہ پیدا ہونا ہے اور خود کو نائے مطلق کی جلوہ گاہ بنا کر اپنی ذات کو ایک نئی شکل میں ڈھالنا ہے۔اور یہ مقام درون ذات میں ڈوب کر اپنی حقیقت کو پالینے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

چھٹا سوال:-وہ جز کیا ہے جو کل سے فزوں تر ہے؟ اس جز کے تلاش کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

چھٹے سوال کا جواب علامہ نے چونتیس (34) اشعار میں دیا ہے۔ان میں خودی کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ خودی دیگر اشیا کی طرح مجبور اور بے بس نہیں ہے۔یہ جب اپنے آپ سے مجبوری کی گرد جھاڑ لیتی ہے تو اپنے جہان کو اونٹنی کی طرح ہانکتی ہے۔یہ خودی صرف عشق کی قوت سے حاصل کی جاسکتی ہے۔عشق اور خودی ماورائے فنا ہیں۔عشق اور خودی سے محروم انسان کی زندگی خود موت ہے۔

ساتواں سوال:-مسافر کیسا ہوتا ہے؟ رہرو کون ہے؟ اور میں کسے مردِ تمام کہوں؟

اس سوال کے جواب میں علامہ نے دو بند کہے ہیں جو اکتیس (31) اشعار پر محیط ہیں۔اس سوال کے جواب میں

علامہ کہتے ہیں کہ آدمی کی منزل درونِ ذات میں ہے۔خود سے خود کی طرف سفر کرنے والا مسافر ہے اور جب وہ منزل سے ہمکنار ہو جائے تو رہرو ہو جاتا ہے اور منزل پر پہنچ کر دیدار الٰہی سے مشرف ہونے والا مردِ تمام یا انسان کامل ہے۔

آٹھواں سوال:۔انا الحق کس نکتے کا بیان ہے؟ کیا وہ رمز مطلق فضول تھا؟

اس سوال کے جواب میں علامہ کہتے ہیں کہ ہندوستانی اور ایرانی حکما کے نزدیک کائنات محض ایک وہم ہے، ہمارا وجود خدائے خفتہ کے خواب سے عبارت ہے، جب خدا بیدار ہو جائے گا تو یہ خواب خود ختم ہو جائے گا اور کائنات فنا ہو جائے گی۔یہ محض قیاس ہے جو ظن، تخمین اور شک سے عبارت ہے اور خودی ظن، تخمین اور شک سے بالاتر ہے۔''من'' یا خودی وہم نہیں حقیقت ہے۔انا الحق کا مقصود بھی یہی ہے یعنی انا الحق کہنا خودی یا انا کو حق قرار دینا ہے خود کو حق قرار دینا نہیں۔

نواں سوال:۔وحدت کے راز سے آخر کون واقف ہوا؟ اور عارف آخر کس چیز کا شناسا ہے؟

اس سوال کا جواب علامہ نے تین بند اور ایک غزل کی شکل میں دیا ہے۔یہ جواب پچیس (25) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس جواب میں شامل غزل مشہور فارسی شاعر عراقی کی زمین میں ہے۔عراقی کی غزل کا مطلع ہے:

نخستیں بادہ کاندر جام کردند
زچشمِ مستِ ساقی دام کردند

اس سوال کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دنیا اور اس کی ہر شے بہت حسین و جمیل ہے لیکن اسے دوام نہیں۔اور چونکہ یہ دنیا فانی ہے لہٰذا اس حقیقت کا ادراک کرنے والا ہی عارف ہے۔ذوق و شوق اور جستجو و آرزو سے خودی کو لازوال بنایا جا سکتا ہے۔جب خدا نے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کہا تو بندے نے بَلیٰ کہا اس طرح دونوں کے درمیان محبت کا عہد و پیمان ہوا۔ اس دنیا میں آ کر اپنے وعدے کو یاد رکھنا اور خودی کے ذریعہ خدا تک رسائی حاصل کرنا معرفت ہے۔اور یہی عارف کا مقصد ہے۔نویں سوال کے جواب کے ساتھ مثنوی ''گلشنِ راز جدید'' کے سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہوتا ہے اور اسی تکمیل خودی اور معرفت حق کے پیغام کے ساتھ یہ مثنوی اختتام کو پہنچتی ہے۔

''زبور عجم'' کا چوتھا اور آخری حصہ ''بندگی نامہ'' ہے۔یہ ایک مختصر لیکن انتہائی مفید اور جامع مثنوی ہے جو چار ابواب بندگی نامہ، در بیان فنون لطیفۂ غلاماں، مذہب غلاماں اور در فن تعمیر مردان آزاد پر مشتمل ہے۔''فنون لطیفۂ غلاماں'' کو دو ذیلی عنوانات موسیقی اور مصوری میں تقسیم کیا گیا ہے۔

''بندگی نامہ'' کے آغاز میں علامہ نے اپنے مخصوص اور منفرد انداز میں غلامی کی لعنت کا نقشہ کھینچا ہے۔انھوں نے چاند کی زبان سے درس آزادی دلوایا ہے۔چاند خدا سے شکوہ کرتا ہے کہ تو نے مجھے غلاموں کی خدمت پر مامور کیا ہے۔میں بنی آدم کا طواف کرتا ہوں، اس پر اپنی روشنی نچھاور کرتا ہوں اور اس کو رونق بخشنے کے لیے میں نے گردشِ مدام اختیار کی ہے

لیکن اس کا باطن تاریک ہے۔ یہ زندان غلامی میں گرفتار ہے۔ چاند خدا سے درخواست کرتا ہے کہ یا تو مجھے انسان کی خدمت سے رہائی دے یا اس کی خاک سے نیا آدم تخلیق کر جو مرتبۂ انسانی سے آشنا ہو۔اس کے بعد علامہ غلامی کے مضر اثرات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غلامی سے جسم کے اندر دل مرجاتا ہے۔غلامی سے ملت کی مجلس درہم برہم ہوجاتی ہے اور اس کی وجہ سے مردحق کے اندر زناری کی صفات پیدا ہوجاتی ہیں۔غلام انسان کی کورذوقی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ زہر کو شربت سمجھنے لگتا ہے۔ وہ موت آنے سے پہلے مرجاتا ہے اور اپنی لاش کو کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہے۔آخر میں علامہ کا طرز بیان مزید شدت اختیار کرلیتا ہے اور وہ غلامی کی ایسی دردانگیز تصویر کھینچتے ہیں کہ روح کانپ اٹھتی ہے۔ وہ مثالوں کے ذریعہ اپنی بات واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر کوئی زمین ایسی بنجر ہو جس میں نیش عقرب کے زہر سے کانٹے ہی کانٹے ہوں، جہاں کی چیونٹیاں اژدھوں اور بچھوؤں کا شکار کرتی ہوں، جس کی ہوا سے جہنم کی آگ لپٹی ہوئی ہو، ایسی آگ جس کے پہلو میں سانپ آپس میں لڑ رہے ہوں اور ان سانپوں کے پھن سے زہر ٹپک رہے ہوں۔ بلاؤں کے ایسے عذاب میں سوسال زندگی گزارنا غلامی کے ایک لمحے کی زندگی سے بہتر ہے۔آگے چل کر علامہ غلاموں کے فنون لطیفہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ غلاموں کا نغمہ زندگی سے خالی ہوتا ہے۔غلاموں کے ساز سے پیدا ہونے والے نغمے غلاموں کی فطرت کی طرح بےسوز ہوتے ہیں۔علامہ غلاموں کے نغموں سے بچنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ موت کا نغمہ ہے جس کی آواز کے پردے میں فنا کے سوا کچھ اور نہیں۔اس کے بعد وہ فن کا صحت مند نظریہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نغمہ ایسا ہونا چاہئے جس میں سیلاب کی سی تیزی ہو اور جو اپنے سننے والے کے دل میں زندگی کی حرارت پیدا کرے۔نغمہ ایسا ہونا چاہئے جو پروردۂ جنوں ہو۔ علامہ کہتے ہیں کہ غلام قوموں کی مصوری کا بھی یہی حال ہے۔ان میں نہ تو براہیمی ہے اور نہ ہی آزری۔ان کی مصوری نہ تخلیقی ہے اور نہ تقلیدی۔ یہ صرف ذہنی پستی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔غلام اقوام کے مصور جو تصویریں بناتے ہیں وہ کچھ اس طرح کی ہوتی ہیں کہ ایک راہب دام ہوس میں اسیر ہے تو ایک حسینہ ایک ایسے قفس کے پاس ہے جس میں کوئی چڑیا اسیر ہے۔کہیں کوئی بادشاہ ایک فقیر کے سامنے ہے تو کہیں ایک کوہستانی مزدور لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے ہوئے ہے۔کہیں ایک حسینہ بت خانہ کے راستے پر گامزن ہے تو کہیں کوئی جوگی ایک ویرانے میں گیان دھیان میں مشغول ہے۔ کہیں کوئی سن رسیدہ شخص ہاتھوں میں ایک بجھا ہوا چراغ لیے ہوئے ہے تو کہیں کوئی مطرب کسی نغمۂ بےگانہ سے مست ہے۔کہیں کوئی بلبل نالہ زن ہے جس کے تارِ نفس ٹوٹ جاتے ہیں تو کہیں کوئی نوجوان کسی حسینہ کے تیر نظر کا بسمل ہے۔غرض یہ کہ غلام فنکاروں کے قلم سے صرف موت کے مضامین ٹپکتے ہیں۔ جہاں دیکھئے بس فنا کا افسانہ وافسوں ہے، لیکن یہ تو ہونا ہی ہے کیونکہ غلامی میں جسم روح کی طاقت اور توانائی سے خالی ہوجاتا ہے۔لہٰذا تنِ بےروح سے کسی خیر کی امید عبث ہے۔غلامی میں ایجاد وتحقیق کا ذوق مرجاتا ہے۔علامہ کہتے ہیں کہ یہی حال غلاموں کے مذہب کا ہے۔غلاموں کا مذہب

عشق سے عاری ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کی زندگی بے لطفی اور بے ذوقی سے پُر ہوتی ہے۔ اگر چہ غلام کی زبان پر خدا کا نام ہوتا ہے لیکن اس کا قبلہ اس کے آقاؤں کی طاقت ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے آقا کے سامنے سربسجو د رہتا ہے۔ غلام کا آقا اس کے پاؤں میں زنجیریں نہیں ڈالتا بلکہ اس کے جان ودل کو اسیر کرتا ہے لہٰذا غلام مشکل در مشکل کا شکار ہوتا جاتا ہے۔

غلاموں کے فنون لطیفہ کے پردے میں غلام اقوام کے اذہان وقلوب پر تازیانۂ عبرت برسا کر علامہ اپنے شبدیز قلم کو مردان آزاد کے شاہکاروں کی طرف موڑتے ہیں اور دعوتِ نظارہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اٹھ اور قطب الدین ایبک اور شیر شاہ سوری کے کارناموں کو دیکھ۔ انھوں نے اپنے جاہ وجلال اور عظمت وشکوہ کو اپنی فنکاری کے نمونوں کی شکل میں قائم و دائم کر دیا ہے۔ علامہ تاج محل کی عظمت وسطوت کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہوئے کہتے ہیں کہ ذرا چاندنی رات میں ایک نظر اس خالص موتی پر ڈال۔ اس کے مرمریں جسم میں آب رواں سے بھی زیادہ روانی ہے۔ وہاں کا ایک لمحہ ابد سے بھی پائندہ تر ہے یعنی اسے فنا نہیں ہے۔ آخر میں علامہ نے مردانِ آزاد کے شہکاروں کا سہرا عشق کے سر باندھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مختلف پُر شکوہ عمارتوں کی شکل میں مردوں کے عشق نے اپنے راز کو فاش کیا ہے اور پتھروں کو اپنی نوک پلک سے پرو دیا ہے۔ مَردوں کا عشق بہشت کی طرح پاک ورنگین ہے اور سنگ وخشت سے نغمہ پیدا کر لیتا ہے۔ مَردوں کا عشق نقدِ خوباں کی کسوٹی ہے جو حسن کی پردہ در بھی ہے اور اس کی پردہ دار بھی۔

آخر میں علامہ نے قوت کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جمال اپنی بقا اور تحفظ کے لیے جلال کا محتاج ہے۔ قاہری کے بغیر دلبری محض جادوگری ہے۔ جبکہ قاہری کی معیت میں دلبری پیغمبری کی حامل ہو جاتی ہے۔ اور عشق ہی وہ قوت ہے جو جلال و جمال اور قاہری و دلبری کو ایک نقطۂ اتصال پر متحد کرتا ہے۔ عشق کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے علامہ ’’بندگی نامہ‘‘ کو ختم کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ ’’زبور عجم‘‘ بھی اختتام کو پہنچتی ہے۔

☆☆☆

سید نور عالم
ریسرچ اسکالر، شعبہ فارسی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اصول تفسیر

الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' مصنفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ فارسی زبان میں یہ شاہ صاحب کی شاہ کار تصنیف ہے، جو مفسر اور قرآن مجید کے طالب علم کے لیے خضرِ راہ سے کم نہیں۔ اس تصنیف کی عظمت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے عربی و اردو تراجم بھی کثرت سے ہوئے ہیں، خصوصاً اس کے عربی ترجمے پر تو اصل کا گمان ہوتا ہے۔

کتاب مذکور میں شاہ صاحب کا انداز بیان مقلدانہ نہیں بلکہ محققانہ ہے۔ آپ نے اپنی بات کو تقویت دینے کے لیے جا بجا ''الاتقان'' وغیرہ کے حوالے بھی دیے ہیں مگر ساتھ ہی متقدمین و متأخرین مفسرین کرام کی تسامحات کو بھی بیان کرنے سے گریز نہیں کرتے اور آخر میں آپ کا قول قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے جسے پڑھ کر ایک عام قاری کو بھی یقین ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب کی پیش کردہ تحقیق صحیح و اضح ہے۔

شاہ صاحب کے اس علمی شاہ کار کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ آپ نے دریا کو کوزے میں سمیٹنے کا کام کیا ہے، ناسخ و منسوخ جیسی پیچیدہ بحثوں کو آپ نے بڑی ہی خوش اسلوبی کے ساتھ چند صفحات میں سمیٹ دیا ہے۔ ابتدا سے انتہا تک یہ کتاب حشو و زوائد سے بالکل خالی ہے۔ حسب ضرورت الفاظ و جملے ہی ہیں مگر ضرورت سے کم بھی نہیں کہ قاری کو مضامین و مفاہیم میں دشواری کا سامنا کرنا پڑے۔

اس وقت راقم کے سامنے اس کتاب کے تین نسخے ہیں؛ ایک فارسی نسخہ، ایک عربی اور ایک اردو نسخہ جسے مولانا یٰسین اختر مصباحی صاحب نے اصل فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ ساتھ ہی ایک مفید اور محققانہ مقدمہ بھی سپرد قلم کیا ہے جس نے راقم نے خوب استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب کے تنقیدی مطالعہ میں راقم نے اردو نسخے کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ مصنف علام نے اپنی کتاب کو پانچ ابواب میں تحریر فرمایا ہے، ہر باب کے تحت چند فصلیں بھی ہیں۔

باب اول:

اس باب کے تحت درج ذیل پانچ علوم بیان ہوئے ہیں جنھیں کلام باری تعالیٰ میں صراحت کے ساتھ بیان کیا

گیا ہے۔

ا۔علم احکام: واجب مندوب، مباح، مکروہ اور حرام امور و معاملات کا جاننا خواہ وہ از قسم عبادات ہوں یا معاملات یا تدبیر منزل یا سیاست مدینہ۔اس علم احکام کی تفصیل فقیہ کا فریضہ ہے۔

۲۔علم جدل ومخاصم: چار گمراہ فرقے؛ یہود و نصاریٰ و مشرکین و منافقین سے مباحثہ و مناظرہ کرنا۔اس علم کی توضیح وتصریح متکلم کی ذمہ داری ہے۔

۳۔علم تذکیر بآلاء اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد دلانا) یہ ایسا علم ہے جس میں زمین وآسمان کی تحقیق، بندوں کی ضرورت کے مطابق ان کے دلوں میں اثر آفریں کلمات کا القا اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کاملہ کا بیان اور ان کی توضیح و تشریح کی جاتی ہے۔

۴۔تذکیر بأیام اللہ: (یعنی اللہ تعالیٰ کے انعام وسزا کی یاد دہانی کرانا) یہ وہ علم ہے جس کے ذریعہ مشیت الٰہی کے مطابق فرماں برداروں واطاعت شعاروں کو انعام اور عاصیوں و مجرموں کو دیے جانے والے عذاب جیسے واقعات وحوادث کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۵۔علم تذکیر موت و مابعد موت: یہ علم حشر ونشر، حساب ومیزان اور جنت وجہنم سے متعلق ہے۔

ان تینوں مؤخر الذکر علوم کی تفصیل وتشریح اور ان سے مناسبت رکھنے والی احادیث وآثار مبارکہ کا بیان واعظ ومذکر کا مخصوص فریضہ ہے۔(الفوز الکبیر مترجم،ص:۶۲ مجلس برکات، الجامعۃ الاشرفیہ، مبارک پور ۲۱۰۲ء)

باب اول کے تحت دو فصلیں ہیں؛فصل اول میں مذکورہ بالا پانچ علوم کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

(مشرکین، منافقین، یہود و نصاریٰ) کے باطل مزعومات ومخترعات جسے انھوں نے اپنے عقائد کا حصہ بنا لیا تھا کا قرآن پاک نے جس انداز میں رد بلیغ فرمایا ہے اور ان کے جو اعتراضات تھے،قرآن پاک نے ان کے جو مسکت جوابات دیے ہیں حضرت شاہ صاحب نے بڑے کمال سے سپرد قلم کیا ہے جو انھی کا حصہ ہے۔

فصل ثانی میں علوم خمسہ مذکورہ کے دیگر مباحث سپرد قلم کیے گئے ہیں،مثلاً: تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بالموت و ما بعد الموت اور بیان علم احکام۔

تذکیر بآلاء اللہ کے ضمن میں شاہ صاحب نے یہ حکمت قلمبند فرمائی ہے ''قرآن حکیم ہر طرح کے انسان خواہ وہ عربی ہوں یا عجمی، شہری ہوں یا دیہاتی اور خانہ بدوش، ان سب کی ہدایت واصلاح کے لیے نازل ہوا ہے، اس لیے حکمت الٰہی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ تذکیر بآلاء اللہ (اللہ کی نعمتوں کی یاد دہانی) میں زیادہ بحث وتحقیق نہ ہو اور جتنی بات عام انسان جان اور سمجھ سکتے ہیں، اس سے زیادہ گفتگو نہ کی جائے۔یہی وجہ ہے کہ اسما وصفات الٰہی اس طرز پر بیان کیے گئے

کہ عام انسان بھی اپنے فطری علم وفہم اور ذکاوت وذہانت کے ذریعہ انھیں سمجھ سکے اور اسے فلسفہ ؟الٰہیات وعلم کلام کی کسی ممارست ومہارت کی ضرورت پیش نہ آئے۔(ایضاً،ص:۰۴)

تذکیر بالموت ومابعد الموت کے ضمن میں نزع کے وقت کے حالات، مرنے والے کی بے بسی اور مردے کے سامنے عالم غیب وغیرہ کا منکشف ہونا بیان ہوا ہے۔نیز قرب قیامت کی نشانیاں، قیامت کے ہولناک مناظر، بعث بعد الموت، حشر، میزان، پل صراط، دخول جنت ودخول نار کو کہیں بطریق اجمال تو کہیں تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

فصل ثانی کے اختتام پر شاہ صاحب نے یہ بتایا ہے کہ رسول اکرم ﷺ چوں کہ دین ابراہیمی کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے لہٰذا دین ابراہیمی کے اصول وضوابط کو قرآن مجید نے کافی شرح وبسط سے بیان کیا ہے اور امتداد زمانہ کی وجہ سے ان احکام و قوانین میں جن نقوص وعیوب کی بے جا مداخلت ہوگئی تھی اللہ تعالیٰ نے جابجا ان کی اصلاح فرمائی۔شاہ صاحب رقمطراز ہیں:

قرآن حکیم نے مسائل صلات بطریق اجمال ذکر کیے اور اقامت صلات کا حکم دیا، رسول اللہ ﷺ نے اس کی تفصیل اذان وتعمیر مساجد وجماعت واوقات صلات کے ذریعہ فرمائی۔

مسائل ذکوٰۃ قرآن حکیم نے اختصار کے ساتھ بیان کیا جس کی تفصیل رسول اللہ ﷺ نے فرمائی۔روزہ کا قرآن حکیم نے سورہ بقرہ میں اور حج کا سورہ حج میں ذکر کیا، جہاد کا سورہ بقرہ اور سورہ انفال اور مختلف مقامات میں ذکر کیا۔حدود کا سورہ مائدہ وسورہ نور میں ذکر کیا، میراث کا سورہ نساء میں، نکاح وطلاق کا سورہ بقرہ وسورہ نساء وسورہ طلاق اور دیگر سورتوں میں ذکر کیا۔(ایضاً،ص:۴۴)

احکام وشرائع کے علاوہ حضرت شاہ صاحب نے اہم غزوات وواقعات کا بطور اجمال ذکر کرے، وہ اشارے درج ذیل ہیں:

غزوہ بدر کا واقعہ سورہ انفال میں، غزوہ احد سورہ آل عمران میں، غزوہ خندق سورہ احزاب میں، صلح حدیبیہ سورہ فتح میں، غزوہ بنی نضیر سورہ حشر میں ہے۔

فتح مکہ اور غزوہ تبوک کی ترغیب سورہ برائت میں، حجۃ الوداع کا اشارہ سورہ مائدہ میں، حضرت زینب سے نکاح کا اشارہ سورہ احزاب میں، باندی کی حرمت سورہ تحریم میں ہے۔

قصہ افک سورہ نور میں، تلاوت نبوی اور وفد جن کی سماعت کا ذکر سورہ احقاف میں، ذکر مسجد ضرار سورہ برائت میں، ذکر اسراء سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ایضاً،ص:۵۴)

باب ثانی:

(معانی نظم قرآن کے وجوہ خفا)

اس باب میں پانچ الگ الگ فصلیں ہیں اور درحقیقت ہر فصل بجائے خود ایک الگ باب ہے۔اس باب کے مشمولات کے بارے میں خود شاہ صاحب فرماتے ہیں:

’’علمائے دور حاضر کے اذہان، معنی نظم قرآن سمجھنے میں جو دشواری اور پوشیدگی محسوس کرتے ہیں، ان کے اسباب و وجوہ کی نشان دہی اور واضح و روشن بیان کے ذریعہ خفا اور پوشیدگی و دشواری کے ازالہ کی اس باب میں کوشش کی گئی ہے۔(ایضاً،ص:۵۴)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے الفاظ قرآنی کے معانی ومطالب کے سمجھ نہ آنے کے درج ذیل وجوہات بیان کیے، پھر چار الگ الگ فصلوں میں ان کا حل بھی پیش فرمایا ہے۔

۱۔کبھی لفظ غریب (غیر مانوس ونادر الاستعمال لفظ) کے استعمال کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے جس کا حل یہ ہے کہ صحابہ وتابعین اور اہل معنی سے اس لفظ غریب کا منقول معنی بیان کیا جائے۔

۲۔کبھی ناسخ ومنسوخ نہ جاننے کی وجہ سے۔

۳۔کبھی سبب نزول سے ناواقف ہونے کی وجہ سے۔

۴۔کبھی مضاف یا موصوف وغیرہ کے حذف کی وجہ سے۔

۵۔کبھی ایک چیز کو دوسری چیز سے یا ایک حرف کو دوسرے حرف سے بدلنے کی وجہ سے، کبھی ایک اسم کو دوسرے اسم یا ایک فعل کو دوسرے فعل سے بدلنے کی وجہ سے، یا جمع کو مفرد یا مفرد کو جمع کی جگہ لانے سے، یا مخاطب کی جگہ غائب کا اسلوب اختیار کرنے کی وجہ سے۔

۶۔کبھی مقدم کی جگہ موخر یا موخر کی جگہ مقدم کا ذکر کرنے کی وجہ سے۔

۷۔کبھی انتشار ضمائر اور لفظ واحد سے تعدد مراد کی وجہ سے۔

۸۔کبھی تکرار واطناب کی وجہ سے۔

۹۔کبھی ایجاز واختصار کی وجہ سے۔

۱۰۔کبھی کنایہ وتعریض ومتشابہ ومجاز عقلی کے استعمال کی وجہ سے فہم مراد میں دشواری پیش آتی ہے۔(ایضاً، ص:۶۴)

دوسرے باب کی پہلی فصل میں حضرت شاہ صاحب نے شرح غریب القرآن کی سرخی قائم کر کے اس پر بہت ہی مختصر گفتگو فرمائی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب نیمذکور کے پانچویں باب میں شرح غریب القرآن کو سبب نزول کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔

دوسرے باب کی فصل ثانی میں شاہ صاحب نے کلام مجید کے ناسخ ومنسوخ پر بڑی محققانہ بحث فرمائی ہے۔ شروع میں صحابہ کرام اور تابعین عظام نے نسخ سے جو مراد لیا اسے اور پھر متاخرین کی اصطلاح کا ذکر فرمایا، پھر امام جلال الدین سیوطی کی ''الاتقان فی علوم القرآن'' اور قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن عربی کی ''تفسیر آیات الاحکام'' کی اتباع میں ۱۲ ناسخ ومنسوخ آیتوں کا ذکر کرکے سوائے پانچ آیتوں کے ہر آیت کے آخر میں اپنی تحقیق سے ثابت فرمایا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ محکم ہے۔اس طرح حضرت شاہ صاحب کی تحقیق کی رو سے نواسخ کی تعداد صرف پانچ رہ جاتی ہے۔

دوسرے باب کی تیسری فصل میں شاہ صاحب نے اسباب نزول کی معرفت بیان کی ہے۔حضرت شاہ صاحب اس بات سے بہت برہم نظر آتے ہیں کہ ہر آیت کے ساتھ کسی نہ کسی واقعہ کو جوڑ کر اسی کو شان نزول بنا دیا جائے۔ چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''محمد بن اسحٰق واقدی وکلبی نے اس باب میں افراط سے کام لیتے ہوئے ہر آیت کے ضمن میں ایک واقعہ ذکر کیا ہے۔ان کا اکثر حصہ محدثین کے نزدیک صحیح نہیں اور ان کی سند میں کلام ہے۔'' (ایضاً،ص:۱۶)

اسباب نزول کے سلسلے میں شاہ صاحب نے اس قدر اہتمام فرمایا کہ بخاری، ترمذی، اور حاکم نے اپنی تفاسیر میں جن روایتوں کو سند جید کے ساتھ بیان کیا ہے شاہ صاحب نے ان سب کو کتاب مذکور کے باب خامس میں ذکر کر دیا ہے۔اور ایسا کرنے کا یہ سبب بتایا ہے کہ تا کہ پتہ ہو جائے کہ مطالب آیات سمجھنے میں چند کے سوا اکثر اسباب نزول کا کوئی دخل نہیں۔

اسباب نزول کے بارے میں شاہ صاحب نے اپنی کتاب کے باب اول کے آغاز ہی میں درج ذیل تحریر کے ذریعہ اپنا موقف واضح فرما دیا ہے۔

''مفسرین قرآن عام طور پر آیات جدل ومخاصمہ وآیات احکام میں سے ہر آیت کو کسی واقعہ وقصہ سے جوڑ کر اسی قصہ اور واقعہ کو اس آیت کا سبب نزول (شان نزول) قرار دیتے ہیں۔لیکن امر محقق یہ ہے کہ نزول قرآن کا اصل مقصد تہذیب واصلاحِ انواع بشر اور ان کے درمیان پائے جانے والے عقائد باطلہ واعمالِ فاسدہ کی بیخ کنی ہے۔

درحقیقت آیات مخاصمہ کے اسباب نزول نفوس بشری کی ہدایت وتہذیب اور نوعِ انسانی کے عقائد باطلہ و اعمالہ فاسدہ کا استیصال ہیں۔اس لیے حقیقت یہ ہے کہ مکلّف انسانوں کے عقائد باطلہ، آیات مخاصمہ کا سبب نزول اور ان کے اعمال فاسدہ وتجاوزات ومظالم کا وجود آیات احکام کا سبب نزول ہیں۔اسی طرح آیات تذکیر بآلاء اللہ و ایام اللہ و الموت وما بعدہ کے اسباب نزول انسانوں کی بے توجہی اور شدید غفلت ہیں کہ ان آیات تذکیر کے بغیر وہ ہوش میں نہیں آتے اور ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

واقعات جزئیات اوران کے خصوصی اسباب جن کے بیان و روایت کی مفسرین نے جگہ جگہ بارزحمت اٹھائی ہے،ان کاتفسیر میں کوئی ایسا دخل نہیں جو زیادہ قابل اعتبار ہو،سوائے ان چند اسباب نزول کے جن کاتعلق بعض آیات کریمہ سے ہے جن میں عہد رسالت مآب ﷺ یا اس سے پہلے کے کسی واقعے کی طرف اشارہ ہے،اور سامع و قاری کو جو انتظار اس اشارہ کی وجہ سے درپیش ہے وہ اس واقعہ کی وضاحت کے بغیر ختم نہیں ہوسکتا۔(ایضاً،ص:۷۲)

دوسرے باب کی چوتھی فصل حذف، ابدال، تقدیم وتاخیر، متشابہ، تعریض اور استعارہ ومجاز کے بارے میں شاہ صاحب نے مندرجہ بالا مصطلحات کے اقسام مع تعریفات اور نمونے کے طور کئی ایک مثالیں بھی پیش فرمائی ہیں، طوالت کے خوف سے ذیل میں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے:

حذف: آیت کریمہ:''أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ''(سورہ کہف:۷۴)

کیا تم نے ایک ستھری جان بغیر جان کے بدلے قتل کردی۔''

اس آیت میں ''قتل'' مضاف ہے جو نفس سے پہلے محذوف ہے (اب تقدیر عبارت یوں ہوگی) بغیر قتل نفسٍ۔(ایضاً،ص:۴۶)

۲۔ ابدال: یعنی ایک کلمے کی دوسرے کلمے سے تبدیلی)

آیت کریمہ:''فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ''(سورہ نحل:۱۱۲)

تو اللہ نے اسے یہ سزا چکھائی کہ اسے بھوک اور ڈر کا لباس پہنایا،ان کے کارناموں کے بدلے۔''

''لباس الجوع'' سے مراد ''طعم الجوع'' ہے کیوں کہ بھوک سے پیدا ہونے والی کمزوری و پژمردگی کا اثر لباس کی طرح پورے جسم کے لیے عام ہے۔

۳۔تقدیم وتاخیر:

آیت کریمہ:''وَ لَوْ لَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى''(سورہ طٰہٰ:۱۲۹)

اور اگر تمھارے رب کی ایک بات نہ گزر چکی ہوتی تو ضرور عذاب انھیں لپٹ جاتا اور اگر نہ ہوتا ایک وعدہ ٹھہرایا ہوا۔''

یعنی''و لو لا کلمة سبقت و اجل مسمیً لکان لزاماً''

بقیہ وجوہ خفا (متشابہ، تعریض اور استعارہ ومجاز) کی مثالوں سے شاہ صاحب نے یہ کہہ کر اعراض کیا ہے: المختصر یہ مباحث بہت تفصیل طلب ہیں،ہم نے جتنا ذکر کردیا وہ کافی ہیں۔(ایضاً،ص:۶۷)

لیکن کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہیکہ متشابہ، تعریض اور مجاز عقلی کو حضرت شاہ صاحب نے الگ فصل قائم کرکے بیان کیا ہے اور اس کو فصل خامس کا نام دیا ہے۔

دوسرے باب کی پانچویں اور آخری فصل محکم، متشابہ، کنایہ، تعریض اور مجاز عقلی کے بیان میں ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے مذکورہ بالا مصطلحات کی تعریف کرتے ہوئے مثالوں سے انھیں مزین بھی کیا ہے۔

ا۔محکم: وہ کلام ہے کہ زبان داں اس کا ایک ہی معنی سمجھے (جیسے ''فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ''فرضیت روزہ کے لیے محکم ہے)

۲۔متشابہ: وہ کلام ہے جو دو معانی کا احتمال رکھے، مثلاً آیت کریمہ ''لامَسْتُمُ النِّسَاءَ''(سورہ نساء:۴۳، سورہ مائدہ:۶) لمس کا معنی جماع کرنا بھی ہے اور ہاتھ سے چھونا بھی۔

۳۔کنایہ: اسے کہتے ہیں کہ کوئی حکم ثابت کر کے اس سے بعینہ وہ مراد بہ لیا جائے بلکہ مقصود یہ ہو کہ ذہن مخاطب اس کے لازم معنی کی طرف منتقل ہو، مثلاً آیت کریمہ:

''وَ جَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا''(یٰس:۹)

اور ہم نیان کے آگے دیوار بنادی اور ان کے پیچھے ایک دیوار۔''

آیات قدرت میں تدبر سے اعراض کرنے والے کافروں کو اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص سے تشبیہ دہ ہے جس کے گرد ہر طرف دیوار چن دی گئی ہو اور وہ بالکل نہ دیکھ سکے۔(ایضاً،ص:۷۷)

۳۔تعریض: تعریض یہ ہے کہ کسی عام یا غیر معین بات کا ذکر کیا جائے اور کسی خاص شخص کے حال کا بیان یا کسی معین شخص کے حال پر تنبیہ مقصود ہو۔ جیسے آیت کریمہ:

وَ لَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْۤا اُولِي الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ الْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (نور:۲۲)

اور قسم نہ کھائیں وہ جو تم میں فضیلت والے اور گنجائش والے ہیں، قرابت داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو دینے کی۔''

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تعریض ہے۔

۴۔مجاز عقلی: یہ ہے کہ فاعل کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف فعل کی نسبت ہو مثلاً ''بنی الامیر القصر''امیر نے محل تعمیر کیا۔ حالاں کہ امیر کے حکم سے محل کی تعمیر اس کے معمار کرتے ہیں۔

باب ثالث:

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے الفوز الکبیر فی اصول التفسیر کے تیسرے باب کو دو فصلوں میں تقسیم کیا ہے؛ فصل اول میں اسلوب ترتیب قرآن کا بیان ہے جب کہ فصل ثانی میں قرآن پاک کے اسلوب بلاغت کا ذکر

کر کے اعجاز قرآنی کی جلوہ آرائیوں کا تذکرہ کیا ہے۔

فصل اول:

اس فصل میں بتایا گیا ہے کہ قرآن پاک عام کتابوں کی طرح ابواب وفصول میں منقسم نہیں بلکہ یہ شاہی فرامین و حکایات کی طرح ہے جو وقت حالات اور ضرورت کے پیش نظر حکیم وجبیر رب کی طرف سے اتارا گیا۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

''قرآنی سورتوں کے اسالیب چوں کہ شاہی فرامین سے مناسبت تامہ رکھتے ہیں اس لیے ابتدا وانتہا میں طریقہ؟ مکتوب کی رعایت فرمائی گئی ہے، جس طرح بعض فرامین حمدِ الٰہی سے شروع ہوتے ہیں، بعض کے آغاز میں فرمان لکھنے کا مقصد ہوتا ہے، بعض کے شروع میں مُرسِل اور مُرسَل الیہ کے نام کی صراحت ہوتی ہے، بعض رقعات اور چٹھیاں بغیر کسی عنوان کے ہوتی ہیں، بعض طویل اور بعض مختصر ہوتی ہیں، اسی انداز سے اللہ تعالیٰ نے حمد یا تسبیح سے بعض سورتوں کو شروع فرمایا ہے اور بعض سورتوں کے آغاز میں تنزیل کا مقصد واضح فرمایا ہے، مثلاً آیت کریمہ:

''ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ''

وہ بلند مرتبہ کتاب کوئی شک کی جگہ نہیں، اس میں ہدایت ہے ڈرنے والوں کے لیے۔''

آیت کریمہ: ''سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَ فَرَضْنٰهَا'' (نور:۱)

یہ ایک سورہ ہے جو ہم نے اتاری اور اس کے احکام ہم نے فرض کیے۔''

یہ قسم مندرجہ ذیل تحریروں کے مشابہ ہے:

هذا ما صالح عليه فلان و فلان، و هذا ما اوصىٰ به فلان ۔ یہ وہ معاہدہ ہے جس پر فلاں اور فلاں نے مصالحت کی۔ یہ فلاں کا وصیت نامہ ہے۔'' (ایضاً ص:۰۸)

ان دو مثالوں کے علاوہ بھی شاہ صاحب نے کئی اور مثالوں سے سورتوں اور شاہی فرامین کے درمیان مناسبت ثابت کیا ہے۔

تیسرے باب کی فصل ثانی قرآن مجید کے اسلوب بلاغت کے بیان میں ہے۔ اس باب میں مصنف علام نے اہل عرب، اہل ہند، اہل یونان اور سلیم الفطرت دیہاتیوں کے اشعار واوزان اور ان کی نغمگی کے بارے میں تفصیلی بحث کی ہے، پھر ان کے باہمی اختلافات کے باوجود ان سب میں ایک قدر مشترک رکھا ہے، وہ قدر مشترک اور توافق ہے کلام کی نغمگی اور دل نشینی۔

اس بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی معقولات ومنقولات میں مہارت تامہ رکھنے

کے ساتھ عرب وعجم کے اوزان وقوافی پر بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔

شاہ صاحب نے قرآنی سورتوں کو قصائد اور آیات کو ابیات کے مثل کہا ہے اور اس میں قدر مشترک صرف اس بات کو رکھا ہے کہ دونوں کے قاری کو خوب خوب لذت ملتی ہے۔ اس قدر مشترک کے باوجود دونوں میں خط امتیاز یہ کھینچا ہے کہ اشعار وابیات تو ماہرین فن کا ذہنی اختراع ہوتے ہیں اس لیے کلام پاک میں خلاق فطرت نے آیتوں کو انسانوں کے وضع کردہ اوزان وقوافی کے مطابق نہیں رکھا بلکہ فطری اور سادہ اسلوب میں رکھا۔ اس کی حکمت شاہ صاحب کے نزدیک یہ ہے:

اصطلاحی قواعد وضوابط کے التزام اور ان سے چمٹے رہنے کی بنیاد عجز وجہل ہے۔ ان قواعد سے بے نیاز رہ کر اجمالی حسن اس طرح پیدا کر دینا کہ بیان کی گھاٹیوں اور چوٹیوں پر مضبوط گرفت ہو اور کسی نشیب وفراز میں کلام بے سود نہ ہونے پائے۔ یہ طرز (معجزہ) عاجز ولا جواب کر دینے والا ہے۔ (ایضاً ص: ۴۸)

شاہ صاحب کے مطابق اشعار کی بنیاد اوزان وقوافی پر ہے جب کہ آیات قرآنیہ کی بنیاد انسانی سانسوں پر ہے۔ ہماری سانسیں کبھی لمبی، کبھی، متوسط اور کبھی چھوٹی ہوتی ہیں لہٰذا سورہ نساء کی آیتیں لمبی، سورہ اعراف وسورہ انعام کی آیتیں متوسط جب کہ سورہ؟ شعراء وسورہ دخان کی آیتیں چھوٹی ہیں۔

اس باب کے آخر میں فاضل مصنف نے اعجاز قرآن کے درج ذیل پانچ اسباب تحریر کیے ہیں:

۱۔ دل کش اور انوکھا اسلوب بیان۔ اہل عرب کا مطمح علم چار چیزیں تھیں؛ خطبات، قصائد ورسائل اور محاورات۔ قرآن پاک نے ان سے ہٹ کر اسلوب بیان پیش کیا۔

۲۔ گذشتہ اقوام وملل کے واقعات واحکام۔

۳۔ احوال آئندہ کی خبر۔

۴۔ انسانی قدرت ورسائی سے بلند مقام بلاغت۔

۵۔ اعجاز قرآن کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ شریعت کے اسرار ورموز صرف محققین ومدققین ہی سمجھ سکتے ہیں، باقی ہر عامی وقاری کا کلام اللہ کے دقائق سمجھنا ناممکن ہے۔

چوتھے باب میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کے اقسام وفنون اور قرآن پاک سے متعلق اپنے اوپر واجب العطیات جل وعلا کی طرف سے فائض ہونے والے علوم موہبی کو کسی قدر شرح وبسط کے ساتھ چار الگ الگ فصلوں میں بیان فرمایا ہے، ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

۱۔ محدثین کی تفسیر: یہ حضرات آیات قرآنیہ سے تعلق رکھنے والے احادیث وآثار کو بیان فرماتے ہیں۔

۲۔متکلمین کی تفسیر: اس طبقہ کے متعلق شاہ صاحب فرماتے ہیں:

ایک طبقہ صفات واسمائے الٰہی پر مشتمل آیات کی تاویل وتشریح کرتا ہے اور وہ جو کچھ مذہب تنزیہ کے موافق نہیں سمجھتا اسے اس کے ظاہر سے پھیر کر تاویل صحیح کرتا ہے اور بعض آیات سے متعلق مخالفین کے استدلال کا رد وانکار کرتا ہے۔ یہ طریقہ متکلمین اسلام کا ہے۔ (ایضاً،ص:۰۹)

متکلمین کے اس طریقہ کار سے شاہ صاحب کا طریقہ ذرا مختلف نظر آتا ہے جیسا کہ آپ باب مذکور میں لکھتے ہیں: ''ان امور ومسائل میں میرا مذہب وطریقہ وہی ہے جو امام مالک، سفیان ثوری، عبداللہ بن مبارک اور جملہ متقدمین کا ہے کہ متشابہات کو ان کے ظاہر پر رکھا جائے اور ان کی تاویل میں غور وخوض نہ کیا جائے۔'' (ایضاً،ص:۶۹)

۳۔فقہا کی تفسیر: یہ حضرات آیات محکمات سے احکام کا استنباط کرتے ہیں (آیات قرآنی واحادیث مبارکہ سے احکام کے استنباط کے لیے فقہائے کرام سے ''اصول فقہ'' کے نام سے ایک نئے فن کی ایجاد بھی کی ہے) شاہ صاحب نے اس قسم کو کافی اہمیت دی ہے اور اس سے متعلق اپنے اوپر خصوصی انعام الٰہی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس فقیر (ولی اللہ دہلوی) کے دل میں القا فرمایا ہے کہ استنباطات احکام دس قسموں میں منحصر ہیں۔ ان دس اقسام کی ترتیب بھی اس نے فقیر کے دل میں القا فرمائی ہے جو بہت سے احکام مستنبطہ کو تولنے کے لیے ایک عظیم میزان ہے۔ (ایضاً،ص:۵۹)

مگر زیر نظر کتاب میں ان دسوں میں سے صرف ایک فن یعنی فن توجیہ کا ذکر ملتا ہے۔

۴۔نحویوں اور اہل لغت کی تفسیر: یہ حضرات مشکل الفاظ کے معانی اور معنی کی وضاحت کے پیش نظر عبارتوں کی تراکیب بھی بتاتے جاتے ہیں۔

ایسی تفاسیر میں شاہ صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ ''لغت قرآن کے بارے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ متقدم عربوں کے استعمال سے اخذ کیا جائے اور صحابہ وتابعین کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار پر مکمل اعتماد کیا جائے۔''
(ایضاً،ص:۷۹)

اسی طرح نحوی قواعد کے بارے میں شاہ صاحب کے پیش کردہ اصول کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن پاک پہلے ہے اور سیبویہ وفرّاء کے وضع کردہ قواعد نحو وصرف بعد میں ہیں، لہٰذا قرآن پاک کے الفاظ کو کھینچ تان کر نحویوں کے قواعد کے مطابق نہ کیا جائے۔ مثلاً آیت کریمہ:

''وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ وَالْمُؤْتُونَ الزَّكَاةَ'' کے بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں: ''میرے نزدیک تحقیق حق یہ ہے کہ وَالْمُقِيمِينَ الصَّلَاةَ کو مقام مرفوع (والمقیمون الصلاۃ) مان کر معنی مرفوع میں تفسیر کی جائے۔ واللہ تعالیٰ

العلم ۔(ایضاً،ص:۷۹)

۵۔بلغاء کی تفسیر: یہ طبقہ علم معانی کے نکات کا شافی بیان کرتے ہوئے حق کلام ادا کرتا ہے۔(ایضاً،ص:۹۰)

اس طرح کی تفاسیر کے متعلق شاہ صاحب کی رائے ملاحظہ فرمائیں:

علم معانی و بیان دور صحابہ و تابعین کرام کے بعد کا مدوّن علم ہے جس میں جمہور عرب کے عرف کے مطابق جو باتیں ہیں وہ بسر و چشم قبول ہیں اور جو دقیق باتیں اس میں کے ماہرین و مفسرین ہی سمجھ سکتے ہیں انھیں میں نہیں سمجھتا کہ مطلوب فی القرآن ہیں۔(ایضاً،ص:۷۹)

۶۔قرّاء کی تفسیر: اس کے متعلق شاہ صاحب فرماتے ہیں:''ایک طبقہ اپنے اساتذہ و شیوخ سے منقول قرائت قرآن کی روایت کرتا ہے اور اس بات کی ہر چھوٹی بڑی بات کا ذکر کرتا ہے۔یہ طریقہ قراء قرآن کا ہے۔(ایضاً،ص:۹۰)

اس کے متعلق شاہ صاحب نے اپنی کوئی رائے نہیں دی ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ عہد رسالت و خیر القرون ہی سے قرائت سبعہ یا عشرہ کا دستور رہا ہے اور متعدد احادیث اختلافات قرائت کو بتاتی ہیں اور شاہ صاحب کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ قول رسول کے آگے ہر دم سر تسلیم خم کیے رہتے ہیں۔

۷۔صوفیہ کی تفسیر: یہ حضرات علم سلوک یا علم حقائق پر زیادہ زور دیتے ہیں، اس قسم کی تفسیر کے متعلق شاہ صاحب کا موقف ملاحظہ ہو:

''صوفیہ کرام کے ارشادات و نکات درحقیقت فن تفسیر کا حصہ نہیں، بلکہ قرآن سنتے وقت سالک کے دل میں آنے والی اور نظم قرآن کے درمیان اس کے دل میں پیدا ہونے والی کچھ باتیں ہوتی ہیں، اس وقت سالک کی جو حالت ہوتی ہے یا اسے جو معرفت حاصل ہوتی ہے، اس کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص لیلیٰ و مجنوں کا قصہ سن کر اپنی محبوبہ کی ان یادوں میں کھو جاتا جو اس شخص اور اس کی محبوبہ کے ماضی کا حصہ ہیں۔''(ایضاً،ص:۷۹)

چوتھے باب میں حضرت شاہ صاحب نے از راہ تحدیث نعمت یہ خلاصہ کیا ہے کہ انھیں مذکورہ بالا تمام اقسام تفسیر میں درک حاصل ہے اس کے علاوہ انھیں اور بھی موہبی علوم عطا کیے گئے، جس کا اجمالی بیان بھی باب رابع کی چوتھی فصل میں ہے، بطور شواہد چند اقتباسات پیش خدمت ہیں:

''بحمد اللہ و توفیقہ اس فقیر (ولی اللہ دہلوی) کو ان سارے علوم و فنون سے اچھی خاصی مناسبت ہے، ان کے اکثر اصول اور فروع کے بڑے حصے تک دست رس ہے اور ان کے ہر باب کی ایک خاص تحقیق و استدلال کا ایسا ملکہ حاصل ہو گیا ہے جسے اجتہاد فی المذہب کے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے، بحر فیضان الٰہی سے میرا دل فیضیاب ہے، اور مذکورہ فنون تفسیر کے علاوہ دو یا تین فنون کا میرے دل پر خاص طور پر القا ہوا ہے، سچ پوچھیے تو میں گویا بلا واسطہ تلمیذ قرآن ہوں، جس طرح

حضرت رسالت مآب ﷺ کی روح پرفتوح سے استفادہ کرنے میں اویسی نسبت رکھتا ہوں، اور جیسا کہ میں بغیر کسی واسطہ کے کعبہ شریف سے مستفید اور بغیر کسی واسطہ کے صلاۃ عظمیٰ سے اثر پذیر رہوں۔'' (ایضاً،ص:۱۹)

حضرت شاہ صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ انھیں چار موہبی علوم عطا کیے گئے اور چوتھا موہبی علم خواص قرآن ہے جس کے متعلق فرماتے ہیں:

''(۴) علوم خواص قرآن ہے جس میں اسلاف و متقدمین کے ایک طبقہ نے گفتگو کی ہے، اس طبقہ نے بتایا ہے کہ قرآن کی خاصیتوں کے دو طریقے ہیں؛ ایک طریقہ دعا کی طرح ہے اور دوسرا طریقہ سحر کی طرح ہے جس سحر سے اللہ کی پناہ۔

قرآن حکیم کی منقول خاصیتوں کے علاوہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس فقیر (ولی اللہ دہلوی) پر ایک اور فتح باب کیا ہے کہ ایک بار اس نے اسمائے حسنیٰ اور آیات عظمیٰ و ادعیہ مبارکہ سے میرا دامن بھر کر ارشاد فرمایا کہ یہ ہمارا عطیہ ہے اسے تم کام میں لاؤ۔'' (ایضاً،ص:۱۰۰)

باب پنجم:

یہ باب عربی زبان میں ہے جو من وجہٍ الفوز الکبیر میں داخل اور من وجہٍ خارج ہے۔ مصنف علام نے اس باب کے شروع میں خود وضاحت فرمادی ہے کہ یہ باب پنجم مستقل رسالہ ہے۔ اسی لیے اس کا جداگانہ خطبہ بھی سپرد قلم کیا ہے تاکہ اسے الگ بھی کیا جاسکے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کا جداگانہ نام بھی دیا ہے جو ''فتح... بما لابد من حفظه فی علم التفسیر'' ہے۔

اس باب میں سورہ فاتحہ سے سورہ والناس تک معتبر اور ثقہ روایتوں کے ذریعہ کلام پاک کے غرابت کے شرح و اسباب نزول کو بیان کیا گیا ہے۔ نمونے کے طور پر چند اقتباسات پر اکتفا کیا جاتا ہے:

۱۔''اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَةً''

قد کان فی الارض ان یخلق آدم بالفی عام بنو الجان فافسدوا فی الارض فبعث الله جنوداً من الملائكة فضربوهم حتّٰی لحقوهم بجزائر البحر فقالت الملائكة "أتجعل من يفسد فيها" كما فعل الجن۔

۲۔''و لقد خلقناكم ثم صورناكم'' خلقوا فی اصلاب الرجال و صوروا فی ارحام النساء۔

۳۔سورۃ الناس میں دو لفظوں کی تفسیر بیان ہوئی ہے؛ اول ''الوسواس'' دوم ''من الجنة و الناس''

الوسواس: اذا ولد الشيطان فاذا ذكر الله ذهب واذا لم يذكر الله ثبت فی قلبه۔

من الجنة والناس: بيان للشيطان الموسوس انه جنی وانسی كقوله تعالیٰ: ''شَيَاطِيۡنَ الۡاِنۡسِ وَالۡجِنِّ'' او من الجنة بيان له

والناس عطف علی الوسواس علی کل شر شائل ولید ونباتہ، واعترض بان الناس لا یوسوسون فی صدور الناس انما یوسوس فی صدورھم الجن، واجیب بان الناس یوسوسون ایضاً بمعنی یلیق بھم فی الظاھر ثم اتصل وسوستھم الی القلب وتثبت فیہ بالطریق المودی الی ذلک۔

☆☆☆

ISSN: 2394-5567 **S. No. 20**

بخواندم یکی مرد هندی دبیر سخن گوی و گوینده و یادگیر
(فردوسی)

DABEER

(An International Peer Reviewed Refereed Quarterly Literary Research Journal for Persian Literature)

VOLUME: VII ISSUE: III & IV

JULY - DECEMBER 2020

Editor

Ahmad Naved Yasir Azlan Hyder

Address:

Dabeer Hasan Memorial Library

12, Choudhri Mohalla, Kakori,Lucknow,

U.P.-226101 (INDIA)

Email: dabeerpersian@rediffmail.com

Mob. No. 09410478973

Review Committee

Prof. Azarmi Dukht Safavi, Aligarh

Prof. Shareef Hussain Qasmi, Delhi

Prof. Masood Anwar Alvi Kakorvi, Aligarh

Prof. Umar Kamaluddin Kakorvi, Lucknow

Prof. Tahira Waheed Abbasi, Bhopal

Prof. Mazhar Asif, New Delhi

Editorial Board

Prof. Syed Hasan Abbas, HOD Persian, Banaras Hindu University, Varanasi

Prof. S. M. Asad Ali Khurshid, Director IPR, AMU, Aligarh

Prof. Aleem Ashraf Khan, Department of Persian, DU, Delhi

Prof. Syed Mohammad Asghar, Deptt. Of Persian, AMU

Pro. Shahid Naukhez Azmi, Department of Persian, MANUU, Hyderabad

Dr. Mohammad Aquil, Department of Persian, BHU, Varanasi

Dr. Iftikhar Ahmad, HOD Persian, Maulana Azad College, Calcutta

Dr. Mohammad Qamar Alam, Aligarh Muslim University, Aligarh

Dr. Anjuman Bano Siddiqui, Deptt. Of Persian, Karamat College, Lucknow

Co-Editor

Dr. Mohammad Tauseef Khan Kaker

Assistant Professor, Department of Persian, Aligarh Muslim University, Aligarh

Atifa Jamal

Research Scholar, Department of Persian, Lucknow University, Lucknow

DR. MOHAMMAD ANASH

Centre for Distance and Online Education

Aligarh Muslim University, Aligarh

THE GEO-PHYSICAL FEATURES OF THE SUBA OF ALLAHABAD

Allahabad is situated in the second climate.[1] Its climate was healthy.[2] Allahabad was anciently known as *Prayag*.[3] The Hindus regard it as the king of shrines. Three holy rivers, the Ganges, the *Yamuna* and the *Saraswati* meet there, though the *Saraswati* is not visible.[4]

The *suba* of Allahabad enjoyed an importance of its own because it lies on the road that connects the *suba* of Agra with the *suba* of Bihar.[5] The imperial highway,[6] together with a number of by-ways[7] as well as inland river routes passed through this region.[8]

BOUNDARIES OF THE SUBA

In 1580 the Mughal Emperor Akbar reorganised the territorial boundaries of the whole Mughal Empire and divided it into twelve divisions,[1] "to each of which he gave the

---

[1]. Abul Fazl, *Ain-i Akbari*, Vol. II, Eng. Trans. H.S. Jarrett, Reprinted, Delhi, 2011, p. 169.
[2]. Ibid.
[3]. Ibid.
[4]. Ibid.
[5]. Jean-Baptise Tavernier, *Travels in India*, (1640-67), translated by V. Ball, London, 1889, Vol. I, pp. 113-21; *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 169.
[6]. For detail see Tavernier, Vol. I, op. cit. pp. 113-121; Peter Mundy, *Travels of Peter Mundy in India in Europe and Asia (1608-1667)* edited by Sir R.C. Temple, Hakluyt Society, Vol. II, 2nd Series, XXXV, London, 1914, pp. 83-137; Jagjivandas Gujrati, *Munatkhab-ut Tawarikh,* Add. 26,253, f. 54(b).
[7]. Joseph Tieffenthaler, *Description Historique et Geographique de Inde,* Berlin, 1787. pp. 231-240.
[8]. Ralf Fitch, *England's Pioneer to India and Burma,* edited by J.H. Ryley, London, 1899, p. 100; Reginald Heber, *Narratives of a journey through the upper provinces of India from Calcutta to Bombay,* London, 1849, Vol. I, pp. 26-40; Tavernier, Vol. I, pp. 123-128.

name of *suba* and distinguished them by appellation of tract of country or its capital city."[2] He combined the units, viz. the province of Jaunpur, the province of Kara-Manikpur and the territories of Bandogarh and named them the '*suba* of Allahabad' after its capital. The Suba of Allahabad was divided into 10 *sarkars*, and 177 *mahals*.[3]

The same practice continued in the period under review. The *suba* of Allahabad was bordered in the east by the *suba* of Bihar, in the west by the *suba* of Agra, in the north by the *suba* of Awadh and in the south by the *suba* of Malwa." Its length from Sinjhauli[4] in the Jaunpur district to southern hills was 160 *kos*;[5] and its breadth from Chausa ferry[6] to Ghatampur was 122 *kos*."[7]

The number of *sarkars* increased from ten to seventeen in period of review, the number of *mahals* or *parganas* increased from 177 to 269.[8]

RIVERS

Through the *suba* flowed a number of rivers, few important rivers among them were

(a) **THE GANGA** It was the most important and holy river of the Hindus.[9] The *Ganga* flowed from Haridwar, adopting a course south-east down to Allahabad.

---

1. Abul Fazl, *Akbar Nama*, Vol. III, Eng. tr. H. Beveridge, Calcutta, 1912, pp. 412-413; Abdul Qadir Badauni, *Muntakhab-ut Tawarikh*, Vol. II, ed. Ali Ahmad and Lees, Bib. Ind., Calcutta, 1864-69, pp. 290-291.
2. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 129.
3. Ibid. Vol. II, p. 171.
4. Present Akbarpur in Faizabad District. *Faizabad gazetteer*, p. 185.
5. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 169.
6. Ibid.
7. Ibid; Rai Chhatarman Kayastha, *Chahar Gulshan*, O.P.L. Patna, f. 65(b); Murtaza Husain Bilgrami, *Hadiqat-ul Aqalim*, Nawal K.ishore Press, Lucknow, 1879, p. 663; Teiffenthaler, op. cit. p. 220; Bahadur Singh Bhatnagar, *Yadgar-i Bahaduri*, Central Record Office , Allahabad, f. 118 (a).
8. *Ain-i Akbari*, op. cit. Vol. II, pp. 171-179; *Chahar Gulshan*, op. cit. f. 67(b), mentions the following *sarkars viz*. Allahabad, Banaras, Bhathkhora, Chunar, Ghazipur, Jaunpur, Kalinjar, Kurrah, Kara and Manikpur. Another *sarkar* named Ahmadabad Ghora came into existence about 1656 (S.N. Sinha, p. 293). In the *Khulasat-ut Tawarikh* of Kalyan Singh, O.P.L. Patna, No. 540. p. 30, the total number of *sarkars* mentioned is 16, while *Chahar Gulshan* f. 67 (b) mentions 17 *sarkars*, though it was gives only two new names, viz. Bitha and Barhar. Sir Jadunath *sarkar* identifies Bitha with Bhathkhora which seems to be correct. *Chahar Gulshan in sarkar's India of Aurangzeb*, p. 137. Regarding Barhar, it seems to be misreading of Terhar (Arail), W.K. Firminger, *The Fifth Committee Report from the Select Committee of the House of Commons on the Affairs of the East India Company*, 1812, 3 Volumes, Published in Calcutta, 1917, p. 467.
9. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p.169.

Then it rolled eastwards by south-east down to the Banaras.[1] It was mostly navigable, having a number of forts, as on the confluence of the Ganga and Yamuna.[2]

(b) THE YAMUNA It was the second important river of the *suba*. Rising from a snowy glacier known as *Yamunotri*,[3] the Yamuna followed a much more devious and winding course than the Ganga because its bed, to a great sandy soil, bordering the desert[4]. Yamuna joined the mighty river Ganga at Allahabad.[5]

(c) THE SAI The *Sai* river passed through the *sarkar* of Manikpur. It touched the *mahals* of Rae Bareli[6] and Salon,[7] and near Jaunpur joined the river *Gomti*, which flowed into the Ganges.

(d) THE GHAGRA The mighty river *Ghagra* appears to have served as the northern boundary of the *suba* Allahabad. With south-east course, it touched *pargana* Kahrid,[8] the eastern limits of the *sarkars* of Jaunpur and Ghazipur. It was navigable throughout its length, and caused plenty of damage by its flood during the rainy season.[9]

(e) THE SON The *Son* river rose from Sonbhadra or Son-Mund near *Narbada* at Amar Kantak in the Maikal range in the Baghelkhand. Coming from the west in the eastern direction, crossing the whole of the *sarkar* of Bhathkhora, it flowed into the territory of the *suba* of the Bihar.[10]

---

[1]. G. Smith, *The Geography of British India*, London, 1882, pp. 24-25. Ganga entered the *suba* in *sarkar* Kurrah and flowing through various *sarkars* and *mahals*, it rolled into the *suba* of Bihar from the *pargana* of Ballia in *sarkar* Ghazipur. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 178.

[2]. Thomas Pennant, *The view of Hindoostan*, London, 1798, p. 202.

[3]. *G. Smith*, op. cit. p. 24.

[4]. George Forester, *A Journey from the Bengal to England through the Northern Part of India*, London, 1798, p. 158.

[5]. *Ain-i Akbari*. Vol. II, op. cit. p. 169. The river *Yamuna* during the eighteenth century had a wider bed at Allahabad than the *Ganga*. *Yamuna* flowed towards east-south-east from the new town towards the fort. Tiffenthaler mentioned in his account, "the *Yamuna* whose bed is here greater than that of the *Ganges* doubles itself towards east". Tieffenthaler, op. cit. p. 227.

[6]. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 176; Rae Bareli is situated 26° 14' N and 81° 14' E. *District Gazzetteers U.P., Rae Bareli Gazetteer*, XXXIX 1909, p. 204.

[7]. Salon, a *pargana* in the District of Rae Bareli is situated 26° 2' N and 81° 28' E. *Rae Bareli Gazetteer*, op. cit. p. 214.

[8]. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 174.

[9]. *District Gazzetteers U.P., Azamgarh*, XXXIII 1911, p. 6.

[10]. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. pp. 162-163; *Rewa*, p. 3; *G. Smith,* op. cit. pp. 25 and 29.

(f) THE TONS The Tons was a large river which rises in the hill country Rewa state and the first touches the south of *pargana* Bara near Deora. After following the boundary eastward for a few miles it entered in the district and took an irregular course, generally in a north-easterly direction, as far as its confluence with the Ganges near Sirsa was concerned.[1] It carries a considerable volume of water, its bed is full of boulders and stony rapids, so that it is quite un navigable.[2]

(g) THE BELAN A large river which raises in the high lands of the Vijaigarh and Barhar *parganas* of Mirzapur and flowed through the district in a westerly direction before entering the Meja *tahsil* of Allahabad on its south-eastern border, in the gap between the Vindhyachal hills and the *Panna* ranges.[3] It passes for nine miles through Rewa territory and subsequently follows the district boundaries for five miles till it falls into the river Tons near Kaundi at the junction of Meja and Bara.[4]

(h) THE KEN AND OTHER RIVERS A large river having come out from a lake named *Garhmanda*l in central India followed its course from south to north, and passing through the dense forest, dividing the *sarkar* of Kalinjar into two parts, i.e. *mahals* of Mahoba and Maudha on the west and Ajaigarh and Kalinjar in the east, to join the river Yamuna. It was not possible to cross this river in carriages drawn by two or four horses because it carried enormous stones in its wake.[5] Other rivers were the *Barna*,[6] the *Rind*,[7] the *Sasur Khaderi*[8] which flowed in the Suba, besides a large number of tributaries.

THE LAKES

In the most parts of the *suba* of Allahabad the rivers carried off the drainage with great rapidity, but in a few tracts the surface water are inadequate, with the result that large and shallow lakes (*Jhils*) are formed.

---

[1]. *District Gazzetteers U.P., Allahabad Gazettee*r, XXIII 1911, p. 12.
[2]. Ibid., pp. 12-13.
[3]. Ibid., p. 13
[4]. *Allahabad Gazettee*r, op. cit. p. 13
[5]. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 169; G Smith, op. cit. p. 157; Tieffenthaler, op. cit. p. 242.
[6]. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 169
[7]. Ibid.
[8]. *Allahabad gazetteer*, op. cit. p. 13.

The largest of these were *Jogi taal* near Simra,[1] *Masiaon* and *Raiya jhils* in *Soraon*,[2] *Dani taal* and *Rauwai*, *Sahdawa*, *Jauchand* and *Basudha jhils* in the Sikandra.[3] The *duab* contains the large *Mungari taal* on borders of Kara and Fatehpur,[4] the huge basin of the *Alwara Lake* some 2,500 acres in extent the south-west of Atharban.[5] The *Mung taal, Hanswa taal,* Khaur and *Salethu taal,* the deeper and narrower *jhils* of Narpatganj, Jaselan and Bisaiya.[6] The *Surha taal* was the most important lake of the *suba* in Ballia and its covers a large area.[7]

THE CLIMATE

The climate of the *suba* was very healthy, moderate and quite agreeable.[8] In the hot season, "the west wind blew very hot". Tanks and rivers were affected and the rains were awaited keenly.[9] The summer was excessively hot and the atmosphere appeared dusty till the sun and wind declined.[10] After rains, which ended by October, the winter season started, and it continued about three or four months, and during this season the climate was very delightful.[11] The eastern region of the Suba was moist except in cold weather, while the central part was pleasant in cold, but extremely difficult to tolerate in summer or rainy season, whereas the land lying south of the river *Yamuna*, being a hilly tract had '*extreme climates*'.[12]

---

1. Ibid, p. 15.
2. *Allahabad gazetteer*, op. cit. p. 15.
3. Ibid.
4. Ibid.
5. Ibid.
6. *Rae Bareli Gazetteer*, op. cit. p. 7.
7. *District Gazetteer*, p. 6.
8. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 169; *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 663. The seasons were generally divided into three categories, viz. Cold, Wet, and Dry. The spring and dry season lasted for four months from February to May, the *mansoon* season started all over the flat country in the beginning of June. The heat was unbearable. At Banaras, the cold was so severe in winter "as to render fire necessary", Josiah Condar, *The Modern Traveller*, London. MD CCCXXX, Vol. VII. pp. 30 & 45.
9. Heber, Vol. I, op. cit. pp. 261-270. The hot season was fatal to Europeans but did not affect the peoples of the region. Kindersley, Letters from the Island of Tenerife, Brazil, *The Cape of Good Hope And The East Indies*, London,1777, L. No. LXI.
10. George Viscount Valentia, *Voyages and Travels to India,* Vol. I, London, 1809, p. 127.
11. Kindersley, L. No. LIX. In this letter Kindersley also told us that, "Allahabad was the hottest as well as the coldest place in the season concerned".
12. For more detail see, *Allahabad District Gazetteer*, op. cit. p. 23; *District Gazzetteers U.P. Banaras* XXVI 1909, p. 21; S.N. Sinha, op. cit. p. 4.

THE NATURAL CALAMITIES

On 6th Shaban, 1126 A.H./Friday August 6th, 1714 A.D., a great earthquake was experienced at Allahabad which lasted for half an hour, many buildings were destroyed[1]. Another earthquake was experienced on 20th Shaban 1126 A.H/ Friday August 20th, 1714 A.D.,[2] a big storm of wind and rain occurred at Banaras on the night of the May 7th, 1715 A.D[3]. Allahabad witnessed a famine in 1718 A.D.[4] A typical pestilence caused by "the stench and sickness" started from Allahabad and proceeded towards Agra and Delhi lasting about forty days in between the month of Shawwal and Zulqada 1141 A.H/1729 A.D.[5] The town of Jhusi, situated in front of Allahabad fort on the bank of river Ganga was "washed away" in 1765.[6]

SOIL

The soil of the whole region was divided into two parts – firstly, the *duab* (Land between the *Ganga* and the *Yamuna*) and second was, the land laying south-west of the Yamuna. The first had alluvial soil, while the second had stony soil[7]. In the Doab loam was found excessively. Clay was noticed in great quantities in the low-lands, in the beds of the rivers and in ponds and marshes. Sand was also common and was generally found on "high lying grounds" and in "broad-bridges" with clearly defined boundaries, through "many miles of the country".[8]

The other region was south-west of the river *Yamuna* with its extension to the Vindhya and Kaimur hills.[9] In this region the soil contained *mar* and *kankar*,[1] black in colour,

1. M. Hadi Kamwar Khan, *Tazkirat-us Salatin-i Chaghtai*, O.P.L Patna, Collection, f. 374 (b).
2. *Akhbarat-i Darbar-i Mu'alla*, Vol. XIII, part III, Bibliotheque Nationale, Paris. MS. 613. Transcript in the Sitamau Library, pp. 29-30, dated 3rd *Ramzan* 1126 A.H/Wednesday, 1st September, 1714 A.D.
3. *The Early Annals of the English in Bengal*, edited by C.H. Wilson, Calcutta, Vol. II, part II, p. 39.
4. Aitmad Khan, *Mirat-ul Haqaiq*, Sitamau Rotographs, f. 153 (b).
5. Ghulam Husain Khan Tabatabai, *Siyar-ul Mutakherin*, Vol. II, eng. tr. M. Raymond, Calcutta, 1902, pp. 465-466.
6. Tieffenthaler, op. cit. p. 239.
7. G. Smith, op. cit. p. 146; *A District Officer* (A.D.O.), *Notes On The North-Western Provinces Of India*, London, 1870, p. 2.
8. A.D.O. op. cit. p. 8. Commonly these rivers flow from the eastern region of the Himalayas and bring deposits of soil and the surfaces of this region contain also mixture of sand and clay i.e. '*domat*'.
9. G. Smith, op. cit. p. 146. This region included whole of Bandogarh, areas of Mahoba, Ajaigarh, Kalinjar, Khairgarh, Kantit and Chunar. S.N. Sinha, op. cit. p. 3.

specially adapted for cotton. During dry weather, with the heat of the sun, the soil cracked and splatted. With the first rain, these cracks became "deep fissures" extending "a mile or even more".[2]

FORESTS

There were regular forests in the hilly regions. The hilly tracts from Kalinjar to Chunar and the land lying south of the Kaimur ranges were full of dense forests.[3] Ebony trees were in abundance in the *sarkar* of Kalinjar.[4] The area near near Kantit[5] and Prayag[6] was covered with forests. The entire ravines of the river Ken along with the region of Bandhogarh were covered with heavy vegetation.[7] The *mahals* of Bhadohi (*sarkar* of Allahabad) and other areas of the *sarkar* Chunar were forestry in nature[8]. There were also regular forests in the northern part of the region on the bank of river *Ghagra*.[9] Forest could also be traced in the region of Kara and Manikpur.[10] On the way between Jaunpur and Allahabad it is doubtful if any regular forest existed. No earlier or later

---

1. '*Mar*' is a rich, dark coloured friable soil easily recognised from the large number of minute of '*kankar*' noudles. In its texture it contains a high proportion of organic matter which enables it to be cropped continuously without manure and *kankar* is a stiff tenacious soil with a large percentage of clay and deficiency of sand. *Banda Gazetteer*, op. cit. p. 6.
2. *A.D.O.* op. cit. p. 9. The whole area was composed of detached rocks and hills were found in the entire region. There were parallel ridges running north-east to south-east. The whole region was covered with dense forests. *Rewa District Gazetteer*, op. cit. p. 1.
3. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 669; Shujan Rai Khattri, *Khulusat-ut Tawarikh*, English translation By Sir J.N. Sarkar in India of Aurangzeb, Calcutta, 1901, p. 29; *Ain-i Akbari*, op. cit. Vol. II, p. 170.
4. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 169; *Khulusat-ut Tawarikh*, (J. Sarkar), op. cit. p. 29; *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. 170.
5. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 169.
6. Fitch, op. cit. p. 103.
7. *Rewa Gazetteer*, p. 1.
8. S.N. Sinha, op. cit. p. 9.
9. *Ajaib-ul Afaq Letters of Chhabila Ram and Girdhar Bahadur*, Sitamau Collection, pp. 90-91 and 94. "Across the *Ghagra* to the south, a dense forest existed along the river Tons in the eastern part of Azamgarh district." Irfan Habib, *The Agrarian System of Mughal India 1556-1707*, published in 1963, re-printed, Oxford University Press, New Delhi, 2011. p. 13. The forest was on the southern bank of the river *Saryu*, "the *Chhoti Saryu* or the eastern Tons between Muhammadabad and Mau."
10. Shafi Warid Tehrani, *Mirat-i Waridat* or *Tarikh-i Chaghtai*, Sitamau collection, f. 125(b); Babur, *Baburnama*, eng. tr. by. H.S. Beveridge, London, 1922, Vol. II, p. 488. The forests were witnessed by a 19th century about 1824-25; though it cannot be said to have existed in the same proportion. Heber, op. cit. Vol. I, p. 296.

authority mentions it. It is possible that forests may have existed here and there but not throughout on the highway.[1]

CROPS, VEGETABLES AND FRUITS

The *suba* of Allahabad was very rich in its products. There were generally two copings in a year i.e. the spring and the autumn crop, except in certain areas, where there was only one in a year.[2] The northern belt, which was economically very rich having good 'alluvial soil' produced varieties of fruits, flowers and herbs.

Agriculture was in a flourishing condition, *Jowari* and *Lalidarali*, however, did not grow and Moth was scarce.[3] Wheat, poppy, Persian muskmelon, sugarcane, indigo, and *Singhara* grew in abundance.[4] Regarding the region, south-west of the Yamuna, especially in the territory of Bandogarh, the main crops were wheat, grain, *kodon*, *moth*, cotton, *matar*, *bajra* and *urad.* Among the vegetables grown were cabbages, carrots, garlics and onion. Mango and melon were common fruits.[5] Mango trees were also common in the region[6]. The small fruited banana was very cheap at Mirzapur (*sarkar* Chunar).[7] *Amrud* was very famous.[8] Ghazipur was very famous for rose water and *itr*,[9] and its rose gardens, the rose fields were picturesque and beautiful,[10] these were planted in thousands of acres.[11]

---

1. William Finch, *Early Travels in India,* ed. W. Foster, Oxford, 1921, p. 177. Finch says that a 'Continual forest existed on the highway from Jaunpur to Allahabad'. Irfan Habib (pp. 12-13) says that this statement is a "gross underestimate". No other traveller has supported Finch.
2. *Ain-i Akbari,* Vol. II, op. cit. pp. 98-99.
3. Ibid. p. 169; Tieffenthaler, op. cit. p. 233; *Khulusat-ut Tawarikh,* op. cit. p. 30.
4. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. pp. 98-99.
5. *Rewa Gazetteer*, op.cit. p. 29.
6. Valentia, op.cit. p. 127.
7. *Hadiqat-ul Aqalim,* op. cit. p. 668. This fruit had been in all ages "the food of philosophers of India…" Josiah, op. cit. Vol. VII, p. 54. Fruits like apple, pear, and plum, peach "thrive in the northern provinces". (Ibid).
8. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 172. Irfan Habib (foot notes, p. 50) says that "*amrud*" 'signified a pear' not guava. According to Irfan Habib 'guava' was introduced much later. (For details see ibid).
9. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 667.
10. Heber, op. cit. Vol. I, pp. 233-234.
11. Forester, op. cit. p. 150.

ANIMALS, BIRDS, AND FISHES

The region of Suba Allahabad was full of animal wealth. Elephants were caught in the forests of Kalinjar,[1] Kantit,[2] Chunar,[3] and Kara-Manikpur.[4] Same in the *trans-Yamuna* tract the wild animals of the Allahabad *sarkar* did not differ from those found in the Banaras division and the *duab*, but in the south the number of species were much greater. Occasionally a tiger found its way over the Rewa or Mirzapur border, generally in the *Lolmati* forest, but such visit were rare[5]. Fox and Jackals were very common[6] while wild pigs were found in lowlands of the river *Ganga* and *Ghagra*[7] and black buck in the patches of trees found along the banks of the river *Ganga*, the *Neel Gaai* were also found[8]in the Ballia. Bears,[9] *Sambhar*[10] and *Chinkara*[11] were also found in Suba but not uncommon, wolves and leopard were also traced in the Allahabad region[12]. In Kalinjar kestrels and hawks were captured.[13] Doves and many types of fowls inhabited the forests, and the bank of the *Ganga.*[14] Peafowl and grey partridges were also found in the several places of Allahabad Suba.[15] Wild fowls, such as swans, geese and cranes were found in abundance.[16]

The river *Ganges, Yamuna, Tons* and other rivers and lakes were a store house of fish of sundry sort[17] *rohu*[1] were caught in a large quantity, *karonch, bhakur, nain, tengra, darhi, mangur, singhi, chelwa* and *belgagra* were found in a huge quantities.[2]

---

1. *Khulusat-ut Tawarikh,* op. cit. p. 29; *Hadiqat-ul Aqalim,* op. cit. p. 669; *Ain-i Akbari,* Vol. II, op. cit. p. 170.
2. *Ain-i Akbari,* Vol. II, op. cit. Vol. II, p. 169.
3. Ibid., p. 170.
4. *Baburnama,* Vol. II, op. cit. p. 488. (But I have found no other authority regarding this fact).
5. *Allahabad Gazetteer,* op. cit. p. 18.
6. *District Gazzetteers U.P., Ballia,* XXX 1909, p. 7.
7. Ibid.
8. Ibid; Allahabad *Gazetteer,* op. cit. p. 18.
9. *Allahabad Gazetteer,* op. cit. p. 19.
10. Ibid.
11. Ibid.
12. Ibid, p. 19.
13. *Ain-i Akbari,* Vol. II, op. cit. p. 170.
14. Fitch, op. cit. p. 20.
15. *Allahabad Gazetteer,* op. cit. p. 19.
16. Fitch, op. cit. p. 20.
17. *Allahabad Gazetteer,* op. cit. p. 19.

REPTILES

Different varieties of snakes and other reptiles were found everywhere in the *suba,* such as *Cobra, Krait, rat snake, crocodile, manetas lizard, Python* and etc. these all were found in a large quantity.

TRANSPORTATION

The Suba of Allahabad had a good system of transport both by road and by rivers. The imperial highway (Grand Trunk Road) which built by Sher Shah passed through this region.[3] There was a chain of inns on roads.[4] Rivers were frequently used for passengers and goods traffic. Goods were also transported from Agra to Bengal by river *Yamuna* and *Ganga* and vice versa.[5]

IMPORTANT CITIES

The *suba* of Allahabad had a number of important towns, some of which mention below

(a) ALLAHABAD It was a large city divided into two parts, the old and the new. The new city was more than a mile of length from west-north-west to east-south-east. There were many beautiful gardens. The middle of the city contained houses and shops of merchandise. This new town was more near the *Yamuna* than the Ganga. There was wide open area between the two towns, full of tombs of *Muhammadans*, "where alleys of trees were planted in a row"[6]. On account of the confluence of the

---

1. Fitch, op. cit. p. 20; *Allahabad Gazetteer,* op. cit. p. 20; *Ballia Gazetteer,* op. cit. p. 8.

2. *Allahabad gazetteer*, op. cit. p. 20, *Rewa Gazetteer*, op. cit. p. 8.

3. Tavernier, op. cit. Vol. I, p. 113-114; *The Early Annals of The English in Bengal*, ed. By C.H. Wilson, Calcutta, Vol. II, part II, pp. 38-43, 212-232.

4. Finch, op. cit. p. 179; *Annals*, Vol. II, part II, op. cit. pp. 38-43, 212-232.

5. Fitch, op. cit. p. 100.

6. Tieffenthaler, op. cit. pp. 222-223; Annals, Vol. II, part II, op. cit. p. 40; *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 667; *Khulusat-ut Tawarikh*, op. cit. p. 27; *Chahar Gulshan*, ff. 65(b)-67(a); *Yadgar-i Bahaduri*, f. 117(a); *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 169; Nicola Manucci, *Storia do Mogor* or *Mogul India* (1653-1708), tr. William Irvine, London, 1907, Vol. II, pp. 81-82 & 442; Fitch, op. cit. p. 102; Finch, op. cit. p. 177; Edward Terry, p. 293; Heber, op. cit. Vol. I, p. 439; Pennant, op. cit. Vol. II, p. 202; Thomas Twinning, *Travels in India,* ed. Rev. Williams and W.G. Twinning, p. 156.

three rivers, the place was known as the 'king of shrines' of *Hindus*.[1] In the month of *Magh*, men, women and children from different corners of India assembled here to take a holy bath in the *Sangam* (conference of two rivers).[2]

(b) BANARAS A holy place for *Hindus*, very ancient and large city was situated between the two rivers- the *Barna* and the *Asi*. It was also called *Kashi*. The city lay on the bank of river Ganga.[3] Raja Balwant Singh had built a town called Ramnagar on the opposite side of the river *Ganga*.[4] It's stretched out along the bank of the river for a mile and half, its breadth was of a mile.[5] Banaras was the chief centre of learning and principles of *Hindu* religion.[6]

(c) GHAZIPUR It was a large city on the bank of the river Ganga.[7] Ghazipur was very famous for its *itr*, red rose and perfumes.[8]

(d) MIRZAPUR It was situated on the high bank of the river Ganga and was called 'great Mirzapur' to distinguish it from another Mirzapur. It extended in a direction which turns between the east and north-east.[9] It was a great centre of trade and commerce in the period under review.[10]

(e) JAUNPUR It was situated on the outer bank of the river *Gomti*. This city was a mine of knowledge and treasure of learning.[11] The *itr* and perfume oil of Jaunpur were very famous.[12]

---

1. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 169.
2. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 667; *Khulusat-ut Tawarikh*, op. cit. p. 28; *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 169.
3. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 674; *Khulusat-ut Tawarikh*, pp. 28-29; *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 169; Tieffenthaler, op. cit. p. 228; *Yadgar-i Bahaduri*, op. cit. f. 119(a).
4. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 674.
5. Tieffenthaler, op. cit. p. 228.
6. Tavernier, op. cit. Vol. II, pp. 118 & 130; Mannucci, op. cit. Vol. II, pp. 83 & 428; Fitch, op. cit. op. cit. p. 103; Twinning, op. cit. pp. 329-335. Valentia, op. cit. pp. 104-108; Pennant, op. cit. p. 210; *Yadgar-i Bahaduri*, op. cit. op. cit. f. 118(a).
7. Tieffenthaler, op. cit. p. 231.
8. Forester, op. cit. p.150; Heber, op. cit. Vol. I, pp. 350-355; *Yadgar-i Bahaduri*, op. cit. f. 118(a). Twinning, op. cit. p. 156; *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. pp. 678-679.
9. Tieffenthaler, op. cit. pp. 240-241.
10. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 668; Heber, op. cit. Vol. I, pp. 270 & 416; Twinning, op. cit. p. 156; *Yadgar-i Bahaduri*, op. cit. f. 118 (a).
11. Muhammad Khair-ud Din, *Tazkirat-ul Ulama*, Eng. Trans. Muhammad Sanaullah, Calcutta, 1934, p. 5.
12. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 677; Valentia, op. cit. pp. 127-128; Twinning, op. cit. p. 328; Pennant, op. cit. p. 216.

The *suba* of Allahabad was very rich in the resources and it was well linked both by road and rivers both. About 31 forts were situated in the *suba* in the time of Akbar,[1] the most important among them were the fort were situated at Allahabad,[2] Chunar,[3] Kalinjar[4] and Bandogarh,[5] Another important fort of Vijaigarh was built by Raja Balwant Singh in the period under review[6]. The fort of Jaitpur[7] was also very strong. A lot of small fortresses were built in the period under review and destroyed[8]. The towns and cities of the *suba* were famous throughout India, some due to religious character, some as a great seat of learning.

Mughal rulers could never ignore the *suba* because it lay near to the imperial capital and the route for Bengal and Bihar passed through this region. The situation of the *suba* was very important for any ruler who wanted to establish his hold on northern India. Its alluvial soil and a climate productive of rich harvests all the year round, was in itself sufficient attraction for any political power.

---

1. *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. pp. 169-170.
2. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 663; *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 169.
3. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 674; *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 170.
4. *Hadiqat-ul Aqalim,* op. cit. pp. 668-669; *Ain-i Akbari*, Vol. II, op. cit. p. 170.
5. S.N. Sinha, op. cit. p. 9.
6. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 675.
7. *Hadiqat-ul Aqalim*, op. cit. p. 172.
8. *Akhbarat-i Darbar-i Mu'alla*, Vol. XII, part II, op. cit. p. 223; *Ajaib-ul Afaq*, op. cit. pp. 90-91.

MD.SHAKEEL
Assistant Professor
Department of Arabic and Persian
University of Calcutta, Kolkata

SAROJINI NAIDU AND THE PERSIAN SENSIBILITY: MAPPING HER LITARARY LANDSCAPE

Abstract:

This Paper is an attempt to find out the connection and role of Persian sensibility behind the making of Sarojini Naidu, the Poetess. In this paper I also intend to map in the contours of Naidu's literary landscape and content to ascertain the significance of her writings in the promotion of Indo- Persian cultural ties. This critical exertion will initiate a fresh academic discourse and will be of immense value to the connoisseur of literature. This work will also provide an opportunity for debate and discussion in an altogether new dimension and perspective among the academia in general and the scholars and researchers in the domain of Persian Studies in particular.

Key Words: Sensibility, Contours, Landscape, Mapping, Literary Consciousness, Poetry, Poetic temperament, Muse, Mathnawi, Rubaiyyat, Cultural Relations.

Introduction:

Sarojini Naidu christened as Sarojini Chhatopadheya (1879-1949) barely needs any introduction either in the corridors of political arena or literary circles. This poetic genius was a child prodigy and had special blessings of the Goddess, Muse. She was born and brought up in an enlightened atmosphere and the waves of modern ideas and thoughts of 18^{th} and 19^{th} centuries, both within and outside the country, played a significant role in shaping her socio- political as well as literary consciousness.

Her parents were bestowed with literary refinements and intellectual elegance of high caliber and were open to liberal and progressive ideas of his time. Her father Aghorenath Chattopadheya was a trained scientist of considerable competence. After completing his masters from Calcutta University he went to Europe to pursue higher studies and obtained Doctor of Science, a rare distinction, from Edinburgh University in Scotland. He was a polyglot and was well conversant in many languages such as English, Bengali, Sanskrit, Greek, Hebrew, French, German and Russian (Anu Kumar, p.4). Aghorenath had got a poetic temperament and even used to compose poetry in Urdu.

Aghorenath was a great exponent of girls' education and meticulously worked hard to achieve his goal in this field. Being an energetic member of the Brahmo Samaj he actively participated and remained an active member of many socio- cultural reform movements in the country. He had faced many hardships for his aggressive political activism. He was one of the leading and tireless crusaders in the passage of the special Marriage act which enabled Indians to marry outside their cast and communities (Anu Kumar, p.7).

Sarojini's father married to Varada Sundari Devi, a girl of his own preference. He even took a keen interest in her education and successfully admitted her to a school run by the Brahmo Samaj. She was an accomplished Bengali poetess with an extraordinary voice. She had earned many laurels and awards for her singing and performances during her school days. She whole heartedly supported her husband's determined mission to provide their daughters a quality education along with their sons.

After completing his doctorate, Aghorenath shifted his base from Calcutta to Hyderabd in1878 on the persuasion of the visionary and able diwan of Nizam Asaf Jah VI, Salar Jung I (Naravane, p.14). He worked tirelessly in unison of Salar Jung's vision to build a modern Hyderabad and was instrumental in establishment of the educational institutions like Nizam College and Girl's College. He also received overwhelming support and patronage from these two leaders of the Hyderabad state which enabled him to chase and realize his cherished dreams. It was here in Hyderabad, Sarojini was born to this Bengali couple on 13th February, 1879. The Chattopadhyayas raised their children, including Sarojini in a free and conducive environment of culture and sophistication of this city (Naravane, p. 15).

Sarojini grew up in such a refined atmosphere which was unconventional from any socio-cultural standard. Her father made available the best facilities for her education. He rather forced her to learn English and made it a point that she should always converse in English. She was fortunate to inherit such a socio-political legacy. Her exposure to the socio-political developments in her own country as well as in other parts of the world carved in her a writer and a political leader. Those experiences also provided her an opportunity to actively take part in the Nationalist movements in the country.

Sarojini began her poetic journey at a very tender age and took no time to sway the literary enthusiasts with her charming and mesmerizing poems. For which she is rightly referred to as the "Nightingale of India". As a matter of fact, it was the Persian rendering of her English poem *'Mehir Muneer'* based on the famous legendary romance of 'Mehir and Badar' that drew the attention of the Nizam of Hyderabad towards her poetic talent and offered her a Scholarship to study at the Kings College in London(Anu Kumar, pp.12-13). Her travel to England brought a paradigm shift in her poetic sensibility and gave an opportunity to transform herself into a mature and refined poetess. This stay, in fact marked a new beginning in her poetic journey.

During her stay in England she got the opportunity to acquaint herself with some of the leading poets of English literature particularly Edmund Gosse (1849-1928) and Arthur Symons (1865-1945). These leading lights of English poetry not only influenced her but also mend her mind towards more meaningful and realistic poetry. In fact these poets persuaded her to get closer to the Indian realities and to use native motif rather chasing western imagination which was nothing but an imitation and a futile exercise. She paid heed to this remarkable suggestion and began writing about her natural surroundings such as the Indian landscape and the native scenes taking place in her day to day life instead of drawing pictures of the flora and fauna of English countryside. Thus the Bulbul or Koel gained prominence in her poetry by replacing the Lark or Robin (Naravane, pp.18-19).

Persian literature in the Indian sub-continent:

The arrival of Mahmud of Ghazna in the first quarter of the 11^{th} century (Browne, p.376), revived the Indo-Persian literary contacts. Renound Indologist and writer Al-Beruni came to India with Mahmud of Ghazna and produced one of the finest historical treatises on our country (ibid, p.419). Emergence of the native Indian writer in Persian is

the significant and important feature of this period when people like Abul Faraj Runi, Masud Saad Salman and the likes started composing poetry in Persian.

The liberal patronage of the Slave kings of Delhi Sultanate created an opportunity for the new breed of intelligent writers and poets, with their firm footings on the Indian soil, to emerge and hold forte in our country. Brightest among them was the versatile, multifaceted personality of Amir Khosrau of Delhi (Nomani, pp.88-159). Khosrau not only satisfied the literary and aesthetic sensibilities of Indian population but also mesmerized the people of the Persian speaking world through his charming poetry. Amir Khosrau and his friend Hasan Sijzi of Delhi (ibid, pp.106-108), popularly referred to as Saadi of India (*Saadi-e Hind*) (Khanlari, p.163), brushed their shoulders with the masters of Persian poetry. They produced high standard of lyrics in Persian which is still read with utmost sincerity and appreciated with a great awe by the lovers of the poetry around the world.

What was initiated by the Ghaznavid and developed by the Sultanate kings blossomed in its full maturity during the Mughal period in the subcontinent. The court in Delhi not only witnessed the influx of Persian writers and poets but a number of Indian poets like Faizi Deccani, Abdur Rahim Khan-e Khana, Abul Fazl, Chandra Bhan 'Brahaman', Zebunnissa Makhfi proved their mantles in producing the delicate and beautiful poetry in Persian.

In the later period particularly in 18^{th} – 19^{th} centuries we have Bedil Azimabadi who rules the hearts and minds of the people of Persian speaking world in general and the people of Afghanistan in particular. The genius of Ghalib and Iqbal is adorned and admired not only in Indian sub-continent but throughout the world.

Needless to say that Persian enjoyed the status of an official language or the Court language in India as late as the first decade of the second quarter of the 19^{th} century. It got first jolt when the British Government decided to promote the vernacular languages, through translations, instead of Persian and subsequently the colonial ruler put its weight behind the Anglicists led by Lord McCauley and thus English replaced Persian in 1835 as the official language of the British India (Ghose, pp.30-34). This final blow pushed this language into oblivion after the dominance of almost 5-6 centuries in our country.

Notwithstanding these political maneuvering and biasness, this language enjoyed the position of status marker of culture and literary refinement among the aristocratic

intelligentsia and elites of British India. All most all sections of the educated class people had fair amount of exposure with the Persian curricula at least at their primary or secondary level schooling. This early exposure with this language considerably shaped the cultural and literary consciousness of the people of this country.

Sarojini's parents particularly her father, Aghorenath Chattopadhyay who hailed from the eastern part of Bengal province must have got the opportunity to acquaint with this language during his formative years. In later part of his life he learnt many other languages and used to converse in these languages with ease and command. The Chattopadhyays in their household in Hyderabad used to speak in many languages for example the couple themselves conversed in Bengali while they spoke to their children in Hidustani or in English and they communicated with their servants in Telugu. Their children including Sarojini were multilingual (Naravane, p.16).

Sarojini Naidu and the Persian Ecosphere:

Sarojini was fortunate to grow at a time when liberal and tolerant men like Nizam Asaf Jah and his Dewan Salar Jung-I were at the helm in Hyderabad. She had the opportunity to receive direct guidance from these men of modern and cosmopolitan outlook. She experienced the essence of Muslim culture of Hyderabad from the very beginning. Like her father she also cultivated deep interest in language and literature and spoke many languages such as Urdu, Telugu and English (Naravane, p.16).

Professor Mushirul Hasan in the introduction of his book titled "Sarojini Naidu: Her way with words" confirms about Sarojini's knowledge of Persian. He writes: "She learnt enough Persian as a child to write a play. The Nizam, to whom the play was submitted by her father, recognized her talent and financed her education in England. Later, she frequently used Persian and Urdu verses in her speeches and writing ,and held forth on the quality of three outstanding Urdu poets- Wali Deccani, Mir Taqi Mir, and Ghalib, the two Delhi poets, She cultivated interest in Sufism, recited Jalaluddin Rumi, the great Sufi poet." (Hasan, pp.20-21).

Sarojini Naidu always used to repeat and boast that the very first sound that went into her ears in her childhood were the words of Amir Khusrau (Mokhtar Masood, p.194).She often asked her audience to derive inspiration from the verses of great Persian poets and frequently used to quote the couplets of these poets to ignite enthusiasm and energy in the people. At one such occasion in Allahabad, while speaking on the political turmoil in

the country, especially when the freedom fighters and leaders of the freedom movement were being detained and jailed, she asked her audience to derive inspiration from the following couplet of Amir Khusrau:

ناخدا در کشتی ما گر نه باشد گو مباش

ما خدا داریم ما را ناخدا درکار نیست !

Nakhuda dar kashti-e ma gar na bashad go ma bash

Ma Khuda dareem ma ra nakhuda darker nest !

(What though there is no pilot in our boat?

We need him not, God is with us. We need no pilot.)(As quoted in Narvane,p.33).

Apart from her scanty Persian work and numerous references of Persian poets she has made several Persian icons or legends as the theme of her English poetry. Her first collection of English verses, "*The Golden threshold*" was published from London in 1905.Some of the poems of this collection is : "*The Song of the Princess Zebunnissa*", "*The Pardah Nashin*", "*Humayun to Zubeda*", "*The Queen's Rival*" which is based on a Persian legend(Narvane,p.24). One of her mythological poem "*Damayanti to Nala in the hour of Exile*"(Narvane,p.24). A Mathnawi on the same topic has been composed by the famous Persian poet Faizi Deccani.

Sarojini's second collection, "*The Bird of Time*" was published by William Heinemann of London in 1912. She derived this title from the Fitzgerald's English translation of the *Rubaiyat* of Umar Khayyam:

"*Come, fill the cup, and in the Fire of Spring*

The winter garment of Repentance fling:

The Bird of Time has but a little way

To fly- and Lo!the Bird is on the wing."(As quoted in Naravane,p.26).

Her last collection "*The Broken Wing*" which was published in 1917 also contains many poems thematically closer to the Persian sensibility. For example the poems like "*A Song from Shiraz*", "*The Imam Bara*", "*The Wandering Beggars*" and "*Imperial Delhi*".

Conclusion:

Sarojini Naidu, the poetess, has not only made her strong presence felt on the political as well as literary stage but has also reigned them with vigor and elegance. She has written on diverse topics and themes. If her romantic and nature poetry offers sweet and soothing melody of nightingale her patriotic poems act as a clarion call to wake up the mind from deep slumber and hibernation. The abovementioned poems carry profuse potential in essence and substance for fresh analysis and enquiry to spill it in new vein with Persian perspective. It will certainly bring forth multiple narratives and enrich the academia. As a matter of fact, on a through scrutiny and assessment of her poetry and political inclinations, it can be ascertained that her writing has played a significant role in strengthening and promoting the Indo-Persian cultural ties. Thus she rightly deserves to be called an ambassador of the Indo-Persian cultural relations.

SELECT BIBLIOGRAPHY:

Browne, Edward G.: *A Literary History of Persia*, Vol. I New Delhi, Goodword Books, 2011.

Ghose, S.C.: *The History of Education in Modern India*, New Delhi, Orient Longman, 19995.

Guha, Anuradha: *Great Women of India: Sarojini Naidu*, New Delhi, Sterling Press Pvt.Ltd, 2003.

Hasan, Mushirul (edited): *Sarojini Naidu: Her Way with Words*, New Delhi, Niyogi Books, 2012.

Kumar, Anu (edited): *Sarojini Naidu: The Nightingle and the Freedom Fighter*, Gurgaon, Hachette India, 2014.

Khanlari, Zohra: *Rahnumai-e Adabiyat-e Farsi*, ----, Ketab Khanai-e Ibne Sina, 1341(Iranian calendar).

Masood, Mukhtar: *Aawaz-e Dost*, New Delhi, Mirza World Book, 2012.

Naravane, Vishwanath S.: *Sarojini Naidu: An Introduction to Her Life, Work and Poetry*, New Delhi, Orient Longman, 1980.

Nomani, Allama Shibli: *Sherul Ajam*,Vol.II, Azamgarh, Darul Musannefin Shibli Academy, 2011.

MOHAMMAD FAHAD ANSARI

PhD Scholar, Department of Persian

Jawahar Lal Nehru University, New Delhi

Reading Iranian Renaissance through Fiction

Fiction is the term used to describe any story created in the imagination, rather than based on only history or fact. It is an act of imaginative and revolutionary invention in a manner whose authenticity of reality is not usually assumed. In other words, since fiction is free of any necessary embedding of facts, it is required to portray not only characters that are actual persons or representations that are factually accurate but also characters that are generally open to interpretation. Fiction can be expressed in a variety of formats, including novels, short stories, fables, legends, myths, fairy tales, epic and narrative, live performances, films, television programs, video games, and role-playing games.

The evolution of the story first began even before man could write. It was started in the form of storytelling. During this early period, storytellers mostly relied on stock phrases, fixed rhythms, and rhymes to aid themselves in constructing and memorizing tales.

The early literature was mainly produced by some of the world's earliest civilizations—those of ancient Egypt, Sumerian and Indus valley - as early as the 4th millennium BC. Major stories from the ancient Middle East were in verse: "The War of the Gods", "The Story of Adapa" (both Babylonian), "The Heavenly Bow", and "The King Who Forgot" (both Canaanite). During the second millennium B.C., these tales were engraved in cuneiform on clay, and world-famous Indian stories such as "Panchatantra," "Jataka Tales," and others in the Sanskrit language were also versed during that early period.

In Iran, modern novel writing was started with the translation works of European writers by famous Persian scholars like - Mirza Fath Ali khan Akhondzadeh, Zainul Abediin Moraghe ii, Mohammad Baqar Mirza Khusravi, Sheikh Musa, Sanaati Zadeh Kirmani, etc. They were the scholars who introduced European literature to Persian people in the

form of a novel. 'Sayahat name Ibrahim baig' by Zainul Abediin Moragheii, is regarded as the first novel in Persian literature.

The early writings in the form of novels brought a revolution in awakening people - socially and politically. It also led to the emergence of a new reading public, mainly urban and middle class, with new tastes and preferences, and with time to allot to reading in the privacy of their homes.

However, with the increase of technology and modernization, people around the globe have lost their interest in reading novels. Iran was no different in experiencing similar changes. This trend paved the way for the development of short story writings in Iran and around the world, more or less during the same period. It gained popularity because it was different from novels with respect to the subject and content of writings, and more importantly, it saves precious time. That is why this sort of writing was embraced by people all over the world.

The beginning of short story writings started with the publication of "Farsi Shekar Ast". The very first short story in the Persian language was published in a German magazine Kaaveh from Berlin, followed by a collection of short stories called "Yaki bood yaki na bood" in the year 1922 AD. The above-mentioned works were authored by an Iranian literary genius, Mohammad Ali Jamaal Zadeh also known as the father of short story writing in Iran, due to his contribution to the evolution of short stories. A similar trend was followed by his other writers like Sadique Hedayat, Jalaal Aal Ahmad, Bozorg Alvi, Sadique Chubak, Simiin Daanishwar, Saed Nafisi etc.

These authors have brought sea changes and revolutionized Iranian society with issues like freedom, women rights, equality, human rights, nationalism, westernization, the drain of wealth, criticism on the regime, rules and regulations, customs and traditions like never before. They discussed every issue at length. These contemporary Persian scholars' innovative and out-of-the-box thinking brought great awareness among the Iranian societies. The objective of present article is to highlight the issues discussed in the writings of great Iranian scholars that paved the way for socio-political changes in Iranian society, as well as how fiction played a role in bringing about the Iranian Renaissance.

Description of Socio-Political issues through Short Stories

The writings of several Persian short story writers have left remarkable imprints on Iran and the Persian world. They have played an important role in the awakening of Iranian society. A few of them who were at the forefront in bringing changes in Iranian society are mentioned below –

"Rajol-e- Siyasi" a short story written by **Syed Mohammad Ali Jamal Zadeh** in 1918 and published in 1921 in his anthology ***"Once Upon a Time",*** has been generally read as a scathing critique of the corrupt and ingenuine politics in the wake of the constitutional revolution. In this short story, the author exposes the corrupted environment of politics and how the corrupted political environment has been so normalized that an ordinary person doesn't see it as problematic. Moreover, it is commonly understood that politics is not a place for honest people. In the backdrop of this perception, the author tries to encourage ordinary people to participate in the political process so that the normalized nature of corrupted politics can be eroded.

Jalal Al Ahmad's "***The Seh'tar"*** was published as a collection of thirteen short stories in the book named ***The Seh'tar*** in 1327. This story was about a poor and week player who loved to sing and play seh'tar to share his hidden emotions and inner feelings with others, but because of his financial problems, he could never play the way he wanted and only played for others. The author not only explicitly highlighted the poverty and illiteracy that surrounded the society but also described the wake, pale and poor seh'tar player in a way to shame rich people into persuading the readers to think deeply.

"Mohalil" is a masterpiece of **Sadique Hedayat** that depicts a very sensitive social issue relating to conjugal life. Mr Yadullah, the centre character, gets married to a young and beautiful girl who unfortunately is divorced later. With the passage of time, Yadullah thinks of remarrying her. But according to law, the divorce has to undergo some hard-legal procedure in order to remarry her. This story tells how a socially constructed evil (Halala) becomes a barrier for a person to return towards his love and to live a normal life. Thus, this story explains the negative impact of '***Mohalil'*** not only on an individual but also on society as it disrupted the equilibrium of the society that is necessary for the stability of the society and relationship. His short stories played a vital role in shaping the mind of common people and make them aware of their fundamental rights.

"Shahri chon behesht" is the title of a collection of short stories written by **Samin Daneshvar** and published in 1340. She transports the reader to the depths of the deprivation and sufferings of a lower-class woman, who inevitably has to serve and survive. The story vividly depicts the plight of a group of women who were exploited socially, physically, and sexually. Danishvar successfully demonstrates how women are consistently ignored by representatives of the opposite sex as well as their own sex in an increasingly patriarchal environment.

"Khan-e-Pedari", written by **Saed Nafisi,** is a well-written piece about nationalism and the struggle of a person for his place. In this story, it is shown that a person named Nasrullah, who lost his parents in his childhood, loves his city so much that when English came to his city - Herat to occupy the area, everyone in the city migrates to another city, but he is the only person who didn't leave his place and stayed there. This shows the love and nationalism of a person for his place. Through this story, the author attempts to encourage nationalism among the citizen so that they could rethink their decision of leaving their native place.

Conclusion

The current article emphasized how Iranian intellectuals attacked society's oppressive activities through the use of short stories. They questioned society's evil habits and increased consciousness among society's members. They opposed the government, promoted nationalism, advocated for women's rights, equality with men, and wrote about female sexuality in Iranian orthodox culture, chastised society for its apathy toward lower social strata and prevailing evils, defied international intervention in cultural and social life, and brought literature closer to the common person.

BIBLIOGRAPHY

- Al-e Ahmad, Jalal. *Seh'tar*. *Amir Kabir,Tehran, 1970.*
- Ali Jamal Zadeh, Mohammad. *Kuhne Wa Nau.* Intesharat-e- Shokhan, Tehran, 2005.
- Ali Jamal Zadeh, Mohammad. *Yaki Bud Yaki Na Bud.* Kaveh Publications, Berlin, 1958.
- Chubak, Sadique. *Khima-e Shab Bazi*. Intesharat-e-Jameh Daran. Tehran, 1945.

- *Daneshwar, Simin. Shahri Chun Behisht. ShirkateSahami, Intesharat-e-khwarizni, Tehran, 1363..*
- Hedayat, Sadique. *Seh Qatre Khoon. Amir Kabir,Tehran, 1954.*
- Hedayat, Sadique. *Zinde Be Gur. Amir Kabir,Tehran, 1952.*
- Afshar, Eraj. Nasre *Farsie Maasir*. Kanoone Marefat, Tehran, 1330.
- Ahmad, Zahiruddin. *Naya Irani Adab*. Lahore, 2000.
- *Aryanpur, Yahya. Az SabaTa Nima, Volume -2, Intesharate Zavvar. Tehran, 1994.*
- *Aryanpur, Yahya. Az Nima Ta Rozgaare Ma, Intesharate Zavvar. Tehran, 2003.*
- *Azand, Yaqoob. Adabyat-e-Navin-e-Iran Az Inqalabe Mashrootiyat Ta Inqalabe Islami. Amir Kabir, Tehran,1363.*
- Brown, E.G. *A Literary History of Persia.* Vol, IV, Cambridge, 1978
- Hakmi, Ismail. *Adbiyat-e-Moasir.* danishgah-e-Payam-e-Noor, 1372.
- Hashimi, Rashid. *Adbiyat-e-Moasir.* Ibn-e-Sina publication,1352.
- Istelami, Duktur Mohad. *Barrasi-e-Adbiyat-e-Imroz-e-Iran-Intesharat-e-Amir-Kabir.* Tehran
- Kamshaad, Hasan. *Modern Persian prose literature.* Cambridge, 1996.

SHAMA REHMANI
Centre of Advanced Study, Department of History,
Aligarh Muslim University, Aligarh

Eminent Slaves of *Sultan* Iltutmish: A Political Perspective

Abstract:

Present paper seeks to highlight a critical appraisal of the political perspective of eminent slaves of *Sultan* Iltutmish. A discussion over the split legacy of Muizzi and Qutbi is also important to understand the actual political atmosphere during that particular period of time. It is really interesting to understand that Iltutmish became the new *Sultan* of the *Sultanate* at that time when the legal heir of the kingdom was alive. After ascending over the throne of the *Sultanate*, Iltutmish not only conquered the regions but also ruled over these territories with the help of his Turkish slaves. These eminent slaves were not homogenous and belong to different tribal groups. Most of them were purchased, attained training, performed duties and finally *Sultan* Iltutmish conferred them royal dignitary posts and assignment of the *iqtas*.

Key words: Eminent Slaves, Muizzi, Nobility, Qutbi, Shamsi, *Sultan* Iltutmish.

From the beginning of the Turkish subjugation in India, we perceived the nobility till the end of time occupied a crucial place to comprehend Turkish realm and its management.[1]After the death of *Sultan* Muiz-ud Din and *Sultan* Qutb-ud Din Aibek, we seeming the view of split legacy of Muizzi nobles through the *Tabaqat-i-Nasiri* of Minhaj-us Siraj. At that time Delhi was not considered as a supreme territory and struggled to attain its sovereignty from the neighboring regions. Hasan Nizami and Minhaj, both historians described clash among these neighboring states to accomplish power and authority.[2] Minhaj clearly pointed the partition of the authority of Muizzi

[1] S. B. P. Nigam, *Nobility under the Sultans of Delhi (1206-1398 A. D.),* Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi, 1968, p. 21.
[2] Sunil Kumar, *The Emergence of the Delhi Sultanate 1192-1286,* Permanent Black, Delhi, 2007, p. 129.

inheritance in North India. Taj-ud Din Yalduz ruled over the Ghazni, Nasir-ud Din Qubacha on Sindh, province of Lakhanauti come under the control of Khalaj *Sultans* and Maliks and Delhi controlled by *Sultan* Iltutmish. [1]

A notable characteristic of the armies and the political systems of the Abbasids caliphs was omnipresent of the martial slaves and this feature continued in *Sultanate* period too. Nizam-ul Mulk Tusi, who was a Seljuq wazir, described in his famous book *Siyasatnamah* about the recruitment of the slaves to unite the political vigor of the sovereign.[2]

Qutb-ud Din Aibek strengthened his position through the operations of his Amirs and slaves. It was really strange to think that Aibek had a son, Aram Shah for succession but contemporary historians clearly pointed out that he was not able to rule over the *Sultanate*. After the death of Qutb-ud Din Aibek, Qutbi Slaves, Free Amirs and his own son Aram Shah contended themselves to attain their master's legacy. A war of succession perceived in that situation whereas only one legal heir was there. A disagreement of progression provides political rapport on the question of legacy and creating the authority of *Sultanat*e.[3]

On the death of Qutb-ud Din Aibek Muizzi legacy became powerful in Benaras and Awadh along with Sindh, Bayana, Lahore, Lakhanauti and little with Lahore-Delhi.

Minhaj-us Siraj mentioned in his *Tabaqat-i Nasiri* that there was two challenging groups exist in that political condition, one was Muizzi and the other one Qutbi. These two political contenders continue engaged in hostility to grasp the political power and authority of the *Sultanate*. North Indian political vicinity controlled by Muizzi Amirs, whereas the Qutbi were the split group. On the one side, there were senior martial slaves and commanders in which one of them was the governor of Badaun Shams-ud Din Iltutmish and on the other side we find commanders, and soldiers of the central deputation of royal army stationed at Lahore. Senior slaves, who not attained the position of governors by *Sultan* Qutb-ud Din Aibek, actually guided these royal armies.[4]

---

[1] Minhaj-us-Siraj Jurjani, *Tabaqat-i-Nasiri*, Ed. Abdul Hayy Habibi, 2 vols., Anjuman Tarikh Afghanistan, Kabul, 1332; Tr. H. G. Raverty, *Tabakat-i-Nasiri*, vols. II, Low Price Publications, New Delhi, 2010, p. 418.
[2] Ali Hasan Ibn Ali Nizam ul Mulk Tusi, *Siyasatnamah,* (ed.) by Schefer, paris, 1891.
[3] Sunil Kumar, *The Emergence of the Delhi Sultanate 1192-1286,* op. cit., p. 130.
[4] ibid., pp., 131-132.

On the death of Qutb-ud Din Aibek, the reactions of Qutbi slaves were changed. Supporters of Aram Shah stationed at Lahore, were the sections of the central deputation. They were acknowledging their master's son to think that it was their legal duty.[1]

There were also some political reasons why these Qutbi supported Aram Shah as a successor. Minhaj clarified that, Qutbi upheld Aram Shah to control rebellion and encourage the reassure of the people and the assurance of the soldiers of the central contingent. These lines explained that to raise Aram Shah for the throne, these slaves were not fulfilling their legal duty but for their own sake. Behind all these, they wanted to handle public orders for the advantage of their personal group. Further the comfort and confidence of the Qutbi visualized endorsement of their personal objectives. They wanted to become the real executers of power and authority behind the puppet heir like Aram Shah. One more reason behind this was that Ali Ismail who was the *amir-i-daud* along with some other judges and military commanders supported Iltutmish, who was the senior Qutbi slave. It was really surprising that rather than given support to the legal heir, they wanted to sustain power and authority into the hands of Iltutmish who was the slave of his master. Hasan Nizami and Minhaj, both the historians supplied information which is bias. From the reign of Qutb-ud Din Aibek, they inveterate the dominant position of Iltutmish within the attendants. From the time, he purchased till he rose to the elevated post, each minute detail provided by these historians.[2]

One thing is also important to understand that Qutbi slaves were not ready to accept a slave as his new *Sultan.* Because of this reason they supported Aram Shah and disregarded member of his own retinue.[3] But finally all difficulties vanished and Iltutmish became as a new *Sultan* of Delhi.[4]

Over a period of twenty six years of his reign, Iltutmish secured the throne of the *Sultanate* from the opponents. And it was possible only with the help his Turkish slaves. These Turkish slaves were controlled and organized by Iltutmish himself during

---

[1] ibid., p. 132.
[2] ibid., pp., 132-134; See also Mohammad Habib and Khaliq Ahmad Nizami (eds.), *A Comprehensive History of India*, vol-v, People's Publishing House, New Delhi, 1970, p. 207.

[3] ibid., p. 134.
[4] Muhammad Aziz Ahmad, *Political History & Institutions of the Early Turkish Empire of Delhi*, Oriental Books Reprint Corporation, New Delhi, 1972, p. 154.

his life time but after his death they become ambitious and enjoyed monopoly over the power and authority of the throne.[1]

The most revealing part of Minhaj's *Tabaqat-i-Nasri* is the account of his twenty five nobles.[2] Barani inferred in his *Tarikh-i-Firozshahi* about the group of forty nobles of Turks popularly known as *Turkan-i-Chihalghani* who enjoyed power and authority during this period of time.[3]

Gavin Hambly was the first intellectual who observed that the *Chihalghani* was the privileged group of the slaves who secured significant position among the retinue of the Shamsi slaves.[4] Further he included that *Tabaqat-i-Nasiri* provided information about twenty five nobles of forty members of *Chihalghani*.[5]

Irfan Habib precisely opines on the basis of Sufic literature that throughout the *Sultanate* period; slavery was an ordinary observation which was widespread in the society for the vigorous construct of techniques and skills carried by the Ghurid conquerors and *Sultans* of the *Sultanate* from outside India.[6]

If we see these nobles carefully, we find that these Shamsi slaves were not homogenous and divided on the basis of the societal and place of origins. They were Qipchaq, Qara-Khetai, Rumi, Ilbari, Khiva and Turk-i-Garji.[7] Through the original text of the *Tabaqat-i-Nasiri,* we find a separate chapter over these twenty five Shamsi Maliks of Hindustan. Accounts of these Maliks were discussed in chapter xxii of this book.[8]

1. *Malik* Taj-ud Din Sanjar Kaz-lak Khan
2. Al Sani-ul *Malik* Kabir Khan Ayyaz Al Muizzi

---

[1] Khaliq Ahmad Nizami (ed.), *Politics and Society during the Early Medieval Period: Collected Works of Professor Mohammad Habib,* vol. I, People's Publishing House, New Delhi, 1974, p. 106.

[2] Khaliq Ahmad Nizami, *On History and Historians of Medieval India,* Munshiram Manohar Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1983, p. 80.

[3] Khaliq Ahmad Nizami, *On History and Historians of Medieval India,* op. cit., p. 80

[4] Gavin Hambly, Who Were the Chihilgani, the Forty Slaves of Sultan Shams Al-Din Iltutmish of Delhi?, in: *J. P.S.,* vol. x, Iran, 1972, pp., 57-62.

[5] ibid.

[6] Irfan Habib, Slavery in the Delhi Sultanate, Thirteenth and Fourteenth Centuries- Evidence from Sufic Literature, in: *I. H. R.,* vol. xv, Nos. 1-2, Delhi, 1991, p. 248. .

[7] S. Jabir Raza, 'The Turk Officers of Iltutmish and Their Origins: Evidence of Tabaqat-i-Nasiri', S. N. R. Rizvi (ed.), Narratives of the Shared Past: Gangetic Valley Through the Millenium, New Delhi, 2016, p. 97.

[8] Minhaj-us-Siraj Jurjani, *Tabaqat-i-Nasiri*, vols. II, Abdul Hayy Habibi (ed.), op. cit., pp., 03- 49; See also Jackson, Peter, *The Delhi Sultanate: A Political and Military History*, Cambridge University Press, Cambridge, 1999, p. 61.

3. *Malik* Nasir-ud Din Aitimur-ul Bahai
4. *Malik* Saif-ud Din Aibek Uchcha
5. *Malik* Saif-ud Din Aibek Yughantat
6. *Malik* Nusrat-ud Din Tayasi Al-Muizzi
7. *Malik* Izz-ud Din Tughan Khan Tughril
8. *Malik* Tamur Khan
9. *Malik* Hindu Khan Muayyid-ud Din Mubarak-ul Khazin
10. *Malik* Ikhtiyar-ud Din Qara Qash Khan Aet-Kin
11. *Malik* Ikhtiyar-ud Din Altuniah,Tabarhinda
12. *Malik* Ikhtiyar-ud Din Aet-Kin
13. *Malik* Badr-ud Din Sunqar-ul Rumi
14. *Malik* Taj-ud Din Sanjar Qutluq
15. *Malik* Taj-ud Din Sanjar Kuret Khan
16. *Malik* Bat Khan Saif-ud Din Aibek Khitai
17. *Malik* Taj-ud Din Sanjar Turkhan
18. *Malik* Ikhtiyar-ud Din Yuzbak Tughril Khan
19. *Malik* Taj-ud Din Sanjar Arsalan Khan Al-Khwarizmi
20. *Malik* Izz-ud Din Kashlu Khan Al-*Sultani*
21. *Malik* Saif-ud Din Arkuli Dadbak
22. *Malik* Badr-ud DinNusrat Khan Sunqar Sufi
23. *Malik* Nusrat-ud Din Sher Khan
24. *Malik* Kashli Khan Saif-ud Din Aibek Al-Sultani Malik-ul Hijab
25. Al-Khaqan-ul Muazzam Baha-ul Huq wa-ud Din, Ulugh Khan Balban-Al *Sultani*

Major H.G. Raverty also provided a list of these nobles but their sequence was differed from the Chapter xxii of the *Tabaqat-i-Nasiri* of Abdul Hayy Habibi. The list which Raverty provided was as follows: Malik Firoz Iltutmish, the Salar Shahzada of Khwarizm; Malik Ala-ud-Din Jani, Shahzada of Turkistan; Malik Qub-ud-din Husain, Son of Ali, son of Abi Ali, Malik of Ghur; Malik Izz-ud-Din Kabir Khan-i-Ayaz; Malik Ikhtiyar-ud-Din, Hussain; Malik Taj-ud-Din, Sanjar-i-Gajz-lak Khan; Malik Ikhtiyar-ud-Din Daulat Shah-i-Balka, son of Husam-ud-Din, Iwaz Khalji, Malik of Lkhanawati; Malik-ul-Umra, Iftikhar-ud-Din, Amir of Karah; MalikRukn-ud-Din Hamzah-i-Abd-ul-Mlik; Malik Baha-ud-Din, Bulad (Pulad)-i-Nasiri; Malik of Ghur, Nasir-ud-Din, Madini, Shaansabani; Malik Nasir-ud-Din, Mardan Shah, Muhammad-i-Chaush (the Pursuivant);

Malik Nasir-ud-Din of Bindar (Pindar), the Chaush; Malik Nasir-ud-Din-i-Tughan, Feoffee of Budaun; Malik Izz-ud-Din, Tughril, Kutbi (Baha-i); Malik Izz-ud-Din, Bakht-yar, the Khalji; Malik Kara Sunkar-i-Nasiri; Malik Nasir-ud-Din, Aiyitim-i-Baha-I; Malik Asad-ud-Din, Tez Khan-i-Kutbi; Malik Husam-ud-Din, Aghul-Bak, Malik of Awadh; Malik Izz-ud-Din Ali, Nagawri, Siwalkhi.[1]

A closer examination of these Shamsi slaves inferred us that most of them purchased, went through stages of training, and performed duties in the royal household. All of these twenty five slaves had been purchased and trained by Iltutmish before he became *Sultan.* It is also clear that though *Sultan* already had a bond to these slaves and when he became *Sultan,* these trusted nobles attained dignitary posts and deployed some of the important territories of the *Sultanate.* [2]

It is historically correct to say that during this period of time a split legacy of Muizzi and Qutbi was perceived. And finally Iltutmish became victorious to attend the throne of the *Sultanate*. With the help of his band of slaves, Iltutmish conquered the territories in a large extent and also managed the administration of these territories. His twenty five Turkish slaves were belonged to different tribal sections. First they purchased, accomplished their training in the royal household, carried out duties and at the moment when they became the reliable of the *Sultan,* achieved important deployment of the *iqtas* and became the supporter of the *Sultanate.*

Bibliography:-

- Ali Hasan Ibn Ali Nizam ul Mulk Tusi, *Siyasatnamah,* (ed.) by Schefer, paris, 1891.
- Gavin Hambly, Who Were the Chihilgani, the Forty Slaves of Sultan Shams Al-Din Iltutmish of Delhi?, in: *J. P. S.,* vol. x, Iran, 1972.
- Irfan Habib, Slavery in the Delhi Sultanate, Thirteenth and Fourteenth Centuries- Evidence from Sufic Literature, in: *I. H. R.,* vol. xv, Nos. 1-2, Delhi, 1991.

[1] Minhaj-us-Siraj Jurjani, *Tabakat-i-Nasiri*, vol. I, Tr. H. G. Raverty, op. cit., pp. 605-607.
[2] Sunil Kumar, *The Emergence of the Delhi Sultanate 1192-1286*, p. 160.

- Khaliq Ahmad Nizami (ed.), *Politics and Society during the Early Medieval Period: Collected Works of Professor Mohammad Habib*, vol. I, People's Publishing House, New Delhi, 1974.
- Khaliq Ahmad Nizami, *On History and Historians of Medieval India*, Munshiram Manohar Publishers Pvt. Ltd., New Delhi, 1983.
- Minhaj-us-Siraj Jurjani, *Tabaqat-i-Nasiri*, Ed. Abdul Hayy Habibi, Anjuman Tarikh Afghanistan, Kabul, 1332.
- Minhaj-us-Siraj Jurjani, *Tabaqat-i-Nasiri*, tr. Major H. G. Raverty, Low Price Publications, New Delhi, 2010.
- Mohammad Habib and Khaliq Ahmad Nizami (eds.), *A Comprehensive History of India*, vol-v, People's Publishing House, New Delhi, 1970.
- Muhammad Aziz Ahmad, *Political History & Institutions of the Early Turkish Empire of Delhi*, Oriental Books Reprint Corporation, New Delhi, 1972.
- Peter Jackson, *The Delhi Sultanate: A Political and Military History*, Cambridge University Press, Cambridge, 1999.
- S. B. P. Nigam, *Nobility under the Sultans of Delhi (1206-1398 A. D.)*, Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi, 1968.
- S. Jabir Raza, 'The Turk Officers of Iltutmish and Their Origins: Evidence of Tabaqat-i-Nasiri', S. N. R. Rizvi (ed.), Narratives of the Shared Past: Gangetic Valley Through the Millenium, New Delhi, 2016.
- Sunil Kumar, *The Emergence of the Delhi Sultanate 1192-1286*, Permanent Black, Delhi, 2007.

AIJAZ AHMAD
(Research Scholar)
Department of West Asian and North African Studies
Aligarh Muslim University, Aligarh

India, Turkey and Israel: War against Terrorism

Abstract

Al-Qaida's attacks on Washington and New York on September 11, 2001, have sparked widespread international agreement on the threat presented by terrorism. This new focus offers Israel and Turkey once-in-a-lifetime opportunity to deepen their strategic engagement. Turkish officials had already acknowledged that counter-terrorism collaboration was a key objective of the growing Israeli-Turkish treaty as early as 1993. The strategic environment after September 11 had also introduced a significant component to the Israeli-Indian dynamic. Cooperation in the fight against terrorism has long been a feature of the two countries' relationship. War against terrorism is of paramount importance to all three countries. Terrorism takes numerous forms, and each of the three countries has had to deal with distinct types of it. Israel, a variety of nationalist Palestinian factions' terrorism, Turkey, the PKK's violence, and India, the threat of Naxalites, Tamil separatist, and Kashmiri separatist terrorism. Beyond these regional terrorist concerns, a larger threat hangs over all three countries the threat of extremist Islamist groups acting as proxy for hostile regimes and posing significant challenges to internal peace and order in India, Israel, and Turkey. It's perhaps no surprise that Islamic extremism threatens three democratic countries with Hindu, Jewish, and Muslim majorities, respectively. The global nature of Islamist groups is one element that could push all three countries to increase counter-terrorism cooperation.

Key Words: India, Israel, Turkey, Terrorism, War

Introduction

After the end of Cold War, the collapse of the Soviet Union, and the United States' invasion of Kuwait in 1991, Turkey assessed its regional foreign policy choices. “The subtraction of USSR power from the Middle East has turned Turkey from a flank state to a frontline state facing many fronts,” as Turkey's then-foreign minister Hikmet Cetin eloquently explained in 1993. In the aftermath of the end of the Cold War, the demise of the Soviet Union, the war in Kuwait, and the establishment of Pax Americana in the West Asian and North African (WANA) region in particular, India, like Turkey, had to refocus its foreign policy.

When the unrest in Kashmir increased, India lost its longtime military supplier and vital diplomatic friend, the Soviet Union. While maintaining its basic strategy, India began a gradual but necessary adjustment in its policy toward the WANA region. While continuing to support the Palestinian cause during the Madrid Peace talks and after the Oslo Peace Accords, the establishment of diplomatic relations with Israel in early 1992 constituted a significant move. The fact that India voted in favour of UNSC Resolution 687 on April 3, 1991 (imposing tough cease-fire terms on Iraq) was a strong indicator of changes in India's West Asia strategy. India could not ignore the fact that the US had emerged as the undisputed leader of the West both during and after the 1990-1991 Kuwait crises, and given India's reliance on the West, particularly on US good will at the IMF and the World Bank, India could hardly tolerate pressure from these quarters.[1]

In December 1991, India voted in support of UNGA Resolution 46/86, which reversed its November 10, 1975 resolution No.3379, which equated Zionism with racism, and was the first sign of a shift in India's stance toward Israel. . Meetings between Indian and Israeli officials at the UN, the US, and elsewhere were reported shortly after: Following up on its prior decision, India decided on January 29, 1992 to establish full diplomatic relations with Israel. Apart from India's role in the Kuwait problems, this represents a decisive shift in the government's approach to the WANA area. India's position toward Israel has been dubbed a "reversal" by some. The Jewish state was no longer seen as a pariah as it had been in the past.

Indeed, as then-foreign secretary, JN Dixit recognized, "the West Asian scenario has transformed in the post-Gulf war period, and the strait-jacketed combative relations between Israel and the Arab countries have started fading. If India had stayed out of

[1] Ofra Bengio and Gencer Ozlan “Arab Perceptions of Turkey and its Alignment with Israel”, Middle Eastern Studies, Vol. 37, No. 2, April, 2001, PP. 50-92.

these actions, it would have demonstrated a lack of political judgment." In terms of its goals, India's foreign policy may currently be described as far more pragmatic and practical.[1]

Although the end of the Cold War removed one geopolitical reason for US support for Israel, the US continued to aid and support Israel. Following the "Madrid and Oslo peace processes," Israel established a regional strategic cooperation with Turkey. On Syria, Iran, the Kurds, terrorism, and other concerns, Israel and Turkey have grown closer. Since 1993, Israel and Turkey have had strategic ties that have resulted in intelligence cooperation, joint training, military-to-military exchanges, and collaborative defense development. Israeli and Turkish troops and navies regularly undertake joint exercises under a 1996 agreement, and Israeli pilots often use Turkey's extensive airspace for flying training. Since 1998, Turkey and Israel have engaged in a recurrent search and rescue exercise in the eastern Mediterranean, called "Reliant Mermaid." "The Israeli-Turkish partnership accomplishes the key purpose of creating an expanded deterrent for both countries," as one writer put it.[2]

Close Turkish-Israeli connections, as well as increased cooperation between India and Turkey and rapid improvement in Indo-Israeli ties, have resulted in triangular cooperation between India, Turkey, and Israel on a variety of topics, including counter-terrorism measures. Military and defense collaboration, as well as intelligence sharing and counter-terrorism coordination, are among the Indo-Israeli links. From MIG jet modifications to the construction of India's MBT-The Arjun, Israel is involved in a number of important Indian military initiatives. Bilateral trade between India and Israel has grown from $200 million in 1992 to $2.5 billion in 2005 and is expected to reach $5 billion in 2008. India has become a popular destination for Israeli entrepreneurs, with more than 100 Israeli companies operating in India in the industries of R&D, manufacturing, and software. In truth, since the UPA government of Prime Minister Manmohan Singh took office in May 2004, India's attitude toward Israel has remained

[1] AK Pasha, "India and Israel: Growing Co-operation", World Focus, Vol. 14, No. 8, August, 1993, PP.19-22; Efraim Inbar, "The Resilence of Israel-Turkish Relations" , Israel Affairs, Vol. 11, No. 4, October, 2005, PP.591-607.

[2] Ilan Berman, "Israel, India and Turkey: Triple Entente" Middle East Quarterly, Fall, 2002, Vol. 9, No. 1

unchanged. "There has been strong continuity of policies from the former Government to the current one," remarked Israel's Ambassador to India, Mr. David Danieli.[1]

There is also a lot of cooperation in the issue of missile defense between India, Israel, and the United States. However, collaboration between India, Israel, and Turkey in the sphere of counter-terrorism is strong, especially following the events of September 11, 2001 in the United States. As one writer put it, "this new focus gives an unprecedented opportunity for Israel and Turkey to extend their strategic discussion." Turkish officials acknowledged that counter-terrorism coordination was a primary objective of the burgeoning Israeli-Turkish entente as early as 1993." Since September 11, 2001, Indo-Israeli counter-terrorism cooperation has taken on a new dimension. "Israel has even sent security experts to Kashmir to train and advise Indian forces."

Mr. Shimon Peres, who visited India in January 2002, described Indo-Israeli collaboration as "a coalition without a choice "since" any government, democratic or otherwise, can forgive or be oblivious to the perils of terrorism." Many Israeli commentators have suggested that a strategic cooperation between Israel, India, and Turkey is forming, and that this "possible entente" offers the US an opportunity to think "outside the box" when it comes to constructing new security institutions in the West Asian region.[2]

Mr. Bulent Ecevit was deposed in November 2002 by the Justice and Development Party (AKP), an Islamist party. In the Grand National Assembly, the AKP obtained a two-thirds majority. With the AKP's huge majority, the Turkish constitution was changed to adhere to EU rules, limiting the involvement of the armed forces in political decision-making, as stipulated by the National Security Council. Mr. K Gajendra Singh, India's former Ambassador to Turkey from 1992 to 1996, claims that "The AKP is taking a risky pathway. The Turkish military is a bulwark and defender of secularism. They most recently forced the resignation of a coalition government led by an Islamist Prime Minister, Najemettin Erbakan, in 1997."[3] Ironically, when in opposition in 1997, former Prime Minister Bulent Ecevit lavished admiration on Indian political groups for refusing to back the BJP's minority government. Mr. Recep Tayep Erdogon, the Turkish Prime

[1] The Hindu, 26,November, 2005

[2] Efria Inbar, "Regional implications of the Israel-Turkish Partnership" , Turkish Studies, Vol. 3, No. 2 Autumn, 2002, PP. 21-43

[3] K. Gajendra Singh, No. 116

Minister, refused to allow US soldiers to transit through Turkey during the invasion of Iraq in March 2003. Turkish decision-makers have been preoccupied with the Kurdish question. The PKK is viewed as a threat in Turkish Kurdish territories, while PKK militants seek safety in areas controlled by the Patriotic Union of Kurdistan [PUK], which is led by Iraqi President Jallal Talabani.

Turkey also has relations with the Kurdistan Democratic Party (KDP), which controls Dahouk and Erbil in northern Iraq and is led by Masoud Barzani, son of Mullah Mustafa Barzani. Turkey genuinely wants a free hand in northern Iraq so that it may intervene whenever it wants to stop its own Kurdish insurgents from using Iraqi territory. Former Turkish President Suleiman Demirel has hinted at the potential, if not the necessity, of changing the Iraqi-Turkish boundary, as well as returning Kirkuk and Mosul to Turkish authority, as they were before the First World War, when the British incorporated these areas into Iraq.[1]

WAR AGAINST TERRORISM

The combating terrorism is of paramount importance to all three countries. Terrorism takes numerous forms, and each of the three countries has encountered different local varieties—Israel, terrorism by a variety of nationalist Palestinian factions, Turkey, PKK violence, and India, terrorism by Naxalites, Tamil separatists, and Kashmiri separatists.

Beyond these regional terrorist concerns, a larger threat hangs over all three countries: the threat of extremist Islamist groups acting as proxy for hostile regimes and posing significant challenges to internal peace and order in India, Israel, and Turkey. Perhaps it is no coincidence that Islamic extremism threatens three democratic countries with Hindu, Jewish, and Muslim majorities, respectively. Islamist groups' transnational nature is one aspect that could push all three governments to cooperate more closely in counterterrorism.

Al-Qaida’s attack on Washington and New York on September 11, 2001, has sparked widespread international agreement on the threat presented by terrorism. This new focus gives an exceptional opportunity for Israel and Turkey to strengthen their strategic engagement. Turkish officials had already acknowledged that counter-terrorism

[1] Bulent Aras, Turkey and The Greater Middle East, (Istanbul: Tasam, 2004, PP. 101-108

collaboration was a key objective of the burgeoning Israeli-Turkish entente as early as 1993.[1] Since then, this concern has increasingly risen on both countries' agendas. The advent of Hezbollah as a significant terrorist powerhouse in neighboring Lebanon, as well as the expanding power of HAMAS and Palestinian Islamic Jihad in the West Bank and Gaza, have become top topics on Israel's national security agenda. While Islamist organizations' influence in Turkey has been reduced, the Turkish military is appropriately concerned about the threat their doctrine poses to the country's secular, democratic principles.

It's not surprising, then, that in the aftermath of September 11, Israeli and Turkish leaders were quick to declare their commitment to working with the US in the fight against terrorism. Both countries, which are threatened by Islamism and other types of regional terrorism, want to be recognized as important allies in Washington's counter-terrorist coalition. "We are in the vanguard of that coalition, which is fighting terrorism. There's no doubt about it" Turkish Prime Minister Ismail Cem said during a recent visit to Israel.[2]

The strategic environment after September 11 had also introduced a significant component to the Israeli-Indian dynamic. Cooperation in the fight against terrorism has long been a feature of the two countries' relationship. In the disputed area of Kashmir, Israel has even dispatched security experts to train and advise Indian forces.[3] However, a lack of understanding of the interdependence of the risks that both countries face has historically hampered cooperation.

However, in the aftermath of the terrorist attacks in the United States, Jerusalem and New Delhi have exhibited a new understanding on the threat of terrorism posed by transnational Islamist extremism. Israeli Foreign Minister Shimon Peres' visit to New Delhi in January 2002 highlighted a growing Israeli recognition of this expanded possibilities for cooperation. Peres publicly acknowledged Indo-Israeli cooperation as "a coalition without a choice because no country democratic or otherwise can forgive or be indifferent to the dangers of terrorism" during talks with Indian Prime Minister Atal Behari Vajpayee, external affairs minister Jaswant Singh, and Defense Minister George

[1] Milliyet (Istanbul), January 27, 1994
[2] The Wall Street Journal Europe, January 23, 2002
[3] The Pakistan Newswire, September 26, 2000

Fernandez.[1] These feelings aren't just a matter of speech. The two countries have increased their military-to-military and regional security coordination in recent years. In the Middle East and South Asia, American diplomacy is now focused on putting out fires. However, American architects need start thinking "outside the box" about new security structures at some point. When they do, they should take note of the developments in Ankara, Jerusalem, and New Delhi, and do even better to build on them.[2]

Conclusion:

India, Israel, and Turkey have collaborated to tackle terrorism. It has been agreed that the suppression of international terrorism, regardless of its source or motive, is a necessary part of maintaining international peace and security. Turkey and Israel also support India's efforts to have the United Nations establish a comprehensive convention on international terrorism, which would be a significant step toward strengthening the international legal framework for addressing this threat. This prospective entente is also an opportunity for the United States. All three countries are pro-Western, stable, and motivated by a shared interest in regional deterrence, missile defence, and counter-terrorism. Together, they might form a pro-Western nexus capable of significantly supporting both US interests and activities. In fact, the United States would be the primary beneficiary of such an entente, as the triad would act as a powerful counterweight to the very states and movements that seek to undermine the United States' position between the Mediterranean and the Indian Ocean: Iraq, Syria, and the Islamist international.

[1] The Times of India (Bombay), January 7, 2002
[2] Ilan Berman, " Israel, India and Turkey: Triple Entente?", Middle East Quarterly, Fall 2002, PP. 33-40